221

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ۔

معارف الآثار

تصنیف

لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید

لمصنّفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

135122

طبع اوّل

جمادی الاوّل ۱۳۸۲ھ — مُطابق اکتوبر ۱۹۶۲ء

قیمت بلا جلد تین روپے — قیمت مجلد چار رُوپے

مطبوعہ الجمعیۃ پریس

دِہلی

Marfat.com

انتساب

(مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم اے کے نام)

سنہ ۱۹۴۱ء کے شروع میں جب جنگِ عظیم دوئم مجھے کھینچ کر شرق الاوسط میں لے گئی۔ میں اُردو زبان میں مضامین تو درکنار خط بھی بخوبی نہ لکھ سکتا تھا۔ چنانچہ مجھے والدہ اور بیوی کو خط لکھنے میں بھی دقت محسوس ہوتی تھی۔ ابتدائی تعلیم تمام تر انگریزی ہی میں ہوئی بعدہٗ سائنس کا طالب علم رہا۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں جب لوٹا تو اپنی تحقیقات کو اردو میں قلمبند کرنا شروع کیا۔ میرا سب سے پہلا مضمون برہان کو بھیجا گیا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب نے اس کی اصلاح کر کے اس کو شائع کرنا منظور کر لیا۔ یہ میری مضمون نویسی کا آغاز تھا۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً جب میں ان کو مضمون بھیجتا تو وہ باقاعدہ طور پر اس کی اصلاح فرما دیتے۔ میری حوصلہ افزائی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ ان کی حوصلہ افزائی ہی کا نتیجہ ہے کہ پچھلے بیس برس میں میرے قلم سے تقریباً دو سو کے قریب اردو میں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اور مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں ذرہ بھر بھی تامل نہیں کہ اگر ان کی راہنمائی میری حوصلہ افزائی نہ کرتی تو آج یہ کتاب منظرِ عام پر نہ آتی۔ چنانچہ اس فنِ مضمون نویسی میں میں ان کو اپنا اُستاد سمجھتا ہوں اور بصد احترام یہ ناچیز کوشش ان کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

Marfat.com

فہرستِ مضامینِ معارف الآثار

پیشِ لفظ ۱۳
۱۔ ہلالِ خصیب اور وادیٔ سندھ۔ ۱۹
۲۔ تاریخ کے دورِ آغاز میں مختلف آرین قومیں ۵۳
۳۔ علم نقل الکلمہ ۷۹
۴۔ ملک طاؤس ۱۰۷
۵۔ تہذیب و تمدنِ آشور ۱۳۳
۶۔ ضمیمہ جات :۔ ۱۵۸
اوّل شجرۂ نسبِ ملوک متعلق مغربی ایشیا بابت سنہ ۱۷۶۰ ق م سے لیکر سنہ ۱۳۴۰ ق م تک ۱۵۸
دوئم :۔ ” ” ” ” ” ” ” ” سنہ ۱۳۴۰ ق م سے لیکر سنہ ۱۲۰۰ ق م تک ۱۶۱
سوئم :۔ ” ” ” ” ” ” ” سنہ ۱۲۰۰ ق م سے لیکر سنہ ۹۰۰ ق م تک ۱۶۲
چہارم :۔ ابتدائی فہرستِ شاہانِ سومر اور آکاد ۱۶۴

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

یہ عزیز مکرم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کی ہی ہمت ہے جو یہ کتاب قارئین کرام کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے ورنہ احقر تو اس کو مرحوم کہہ چکا تھا۔ اس مجبوری اور بے کسی کی حالت میں اس کتاب کا شائع ہو جانا کچھ معجزہ سے کم نہیں۔ مسودہ تو ۱۹۴۶ء میں تیار ہو چکا تھا تقسیم سے پیشتر میں خود بیرونِ ہند چلا گیا۔ برما میں تھا کہ ملک تقسیم ہوا۔ میری مراجعت ۱۹۴۹ء میں حتمی طور پر پاکستان میں ہوئی۔ مسودہ جو ندوۃ المصنفین میں رکھا تھا اطلاع آئی کہ مولانا سعید احمدؒ صاحب اکبر آبادی کی دیگر کتابوں کے ساتھ جل گیا۔ دل پر ایک بجلی سی کوند گئی ایک دوست برما سے دلّی آ رہے تھے، ان کے آنے سے پیشتر پھر اطلاع ملی "یہ مسودہ بچ گیا تھا اور مل گیا ہے"۔ جان میں جان آئی۔ ان دوست کے ہاتھ مسودہ برما منگوا لیا۔ برما سے میرے ساتھ یہ مسودہ پاکستان پہنچا۔ یقینی بات تھی کہ آنے کے ساتھ اس کی اشاعت کا بندوبست نہ ہو سکتا تھا۔ سال ڈیڑھ سال کے بعد مجھے ایران چلا جانا پڑا۔ ۱۹۵۲ء میں لوٹا تو مولانائے مکرم مفتی صاحب کا خط ملا کہ ادارہ کی مالی حالت اب درست ہے لہٰذا مسودہ لوٹا دوں۔ میرے لئے اور خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی کہ یہ مسودہ ندوۃ المصنفین ہی شائع کرے۔ چنانچہ میں نے بغیر پس و پیش انکو لوٹا دیا۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء سے لے کر اب تک مسودہ مسلسل ندوۃ المصنفین ہی میں پڑا رہا۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ندوۃ المصنفین کوئی بیکار تو بیٹھا نہیں ہوا۔ بڑے اعلیٰ پائے کی ایک آدھ درجن کتابیں ہر سال شائع کر دیتا ہے۔ سوال اس کی باری کا تھا۔ ویسے تو اللہ میاں کے ہاں ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کا بھی وقت مقرر ہی

تھا، مگر یہ تمام جدوجہد جو اس کتاب کی اشاعت میں کرنا پڑی اس کا سہرا مولانائے گرامی مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے ہی سر ہے جنھوں نے باوجود اپنی مصروفیتوں کے اس کی کتابت اپنی زیرِ نگرانی کرا کر اس کی تصحیح فرمائی۔ اور ہر بات میں کتاب کی اشاعت کا پورا پورا دھیان دیا۔ ورنہ میں کہاں اور وہ کہاں۔ مشکل ہی تھا کہ میں اس کام میں ان کا ہاتھ بٹا سکتا۔ اس لئے جسقدر بھی میں ان کا شکریہ ادا کروں کم ہے ان کا لطف و کرم پہلے ہی کچھ کیا کم تھا جو اب اس کی تکرار پر بھی وہ مصر رہتے ہیں۔ ایسی کئی ایک مثالیں ان کے احسانوں کی مجھ پر موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ مفتی صاحب ہی اس کتاب کے لکھے جانے کے محرک تھے اور اب اس کی اشاعت کے بھی موجب بنے۔ ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اب کچھ اس کتاب کے مندرجات کے متعلق مختصر طور پر عرض کر دوں۔ اگرچہ یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں مرتب ہو گئی تھی، مگر اس علم میں اس وقت سے اب تک چنداں ترقی نہیں ہوئی چند ایک انکشافات ضرور ہوئے ہیں اور کئی ایک مہمیں مکمل ہو گئی ہیں مگر نتائج وہی کے وہی ہیں جو اس کتاب کے مختلف ابواب میں موجود ہیں۔ تاریخوں کا تعین بھی نہیں بدلا۔ بادشاہوں کی فہرستوں میں بھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ خط میخی کا بھی کوئی ایسا کتبہ حل نہیں ہوا جس کی اہمیت زیادہ ہو اور جس نے کوئی موجودہ نظریۂ تاریخ بدل دیا ہو۔ البتہ چند ایک آلات ایسے ضرور ایجاد ہوئے ہیں جس سے اس علم کی وسعت بڑھ گئی ہے اور تحقیقاتِ ادوار اور اس کا تعین درست تر ہو گیا ہے۔

عراقی کردستان میں کھدائی کی مہم مکمل ہو چکی ہے۔ اور اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس علاقے کی تاریخ قبل از تمدن زمانے تک پہنچ جاتی ہے یعنی ایک لاکھ برس سے لے کر سات ہزار برس تک پہنچتی ہے۔ یہ بات بھی کھدائی نے ثابت کر دی ہے کہ یہاں کی تہذیب مغربی ایشیا کی تہذیبوں سے قدیم ترین ہے۔ آثارِ قدیمہ کی اس تحقیق میں جدید تحقیقاتی آلات استعمال کئے گئے ہیں جو اس سے پیشتر استعمال نہیں ہوئے تھے۔ مثلاً ریڈیو ایکٹو ٹسٹ (

Marfat.com

(RADIO ACTIVE TEST -) اس آلے کے ذریعہ آثارِ قدیمہ کی اصل تاریخ معلوم ہو جاتی ہے۔ اس سے پیشتر تاریخوں کا اندازہ محض قیاس پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ کھدائی کی یہ مہم پروفیسر روبرٹ بریڈ وڈ کی زیرِ نگرانی عمل میں آئی۔ جو تین اداروں کی نگرانی کر رہے تھے۔ ان میں سے پہلا ادارہ اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ شکاگو یونیورسٹی کا تھا۔ دوسرا ادارہ امریکن اسکول آف اورنٹیل ریسرچ کا تھا۔ اور تیسرا خود عراق گورنمنٹ کا محکمۂ آثارِ قدیمہ تھا۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ معلوم کرے کہ ان علاقوں میں تہذیب کا ارتقا کس طرح اور کیونکر ہوا۔ یعنی جس زمانے میں انسان غاروں میں زندگی بسر کرتا تھا اسوقت سے لے کر جب وہ متمدن ہو کر گھریلو زندگی بسر کرنے لگا اُسے کن کن ادوار سے گذرنا پڑا۔ یہ ایک مشکل مسئلہ تھا۔ مگر اس مہم کے سربراہوں نے اسے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دے لیا۔

اس مہم کا میدان کرکوک سے اوپر کی چراگاہیں تھیں۔ جو اربیل کے گردونواح میں پائی جاتی ہیں۔ قارئین کو ان مقامات کا ذکر جابجا مختلف ابواب میں ملے گا۔ اس مقام کو اس لئے ترجیح دی گئی کہ یہی وہ علاقہ تھا جہاں دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں نے جنم لیا۔ قرآن حکیم کا تاریخی حصہ بھی بیشتر اسی علاقہ سے وابستہ ہے۔ اربیل کے گردونواح میں طوفانِ نوح کا حادثہ پیش آیا۔ اور یہاں اس کے آثار بھی ملتے ہیں۔ حضرت یونس اور نمرود کے واقعات بھی اس کے گردونواح میں پیش آئے۔ آگے چل کر تاریخ میں جو جنگِ عظیم سکندر و دارا کے مابین ہوئی وہ بھی اربیل کے میدان (BATTLE OF ARABEAL) ہی میں لڑی گئی۔ یہ میدان اربیل کی پشت پر ہے یہاں سے نینوا صرف ستر میل پر واقع ہے۔ اصل مقام جہاں کھدائی کی گئی ہے اس کو قلعۂ جرمو کہتے ہیں۔ یہاں سب سے پہلے ۱۹۴۸ء میں کام شروع ہوا تھا۔ ابتدا میں یہاں تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے قریب اہم اشیاء دستیاب ہوئیں جو مختلف قسم کی تھیں۔ مثلاً ہڈیاں، گیہوں، کوئلہ اور مٹی کے مختلف نمونے۔ اس جگہ پورا رقبہ جو کھودا گیا وہ پانچ سَو مربع میٹر تھا۔ جو تقریباً تین ایکڑ کے قریب بنتا ہے۔ قلعۂ جرمو کے شمال میں ایک مقام کریم شہیر کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں پر ایک ٹیلہ برآمد

ہوا ہے۔ جس کو عراق حکومت کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے کھودا ہے۔ اس کھدائی سے جو آثار ملے ہیں وہ تقریباً دو ایکڑ رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ تحقیقات کا سلسلہ علاقہ سلیمانیہ تک پھیل گیا ہے۔ یہاں پر ان کو ایک قدیم غار ملا ہے۔ جہاں پر پتھر کے زمانے کے ہتھیار دستیاب ہوئے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس غار میں میرا گذر دو تین مرتبہ ہوا۔ اور جب بھی میں اُدھر سے گذرتا اس غار میں ضرور چلا جاتا۔ اس غار کے وسط میں ایک بہت بڑا پتھر رکھا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جس طرح کسی بادشاہ کے بیٹھنے کے لئے نمایاں جگہ بنائی گئی ہے۔ میں جب بھی جاتا تو اس پتھر پر چڑھ کر ضرور بیٹھ جاتا اور جو دوست میرے ہمراہ ہوتے ان سے کہتا کہ قدیم زمانے میں جب انسان وحشی تھا اور غاروں میں رہا کرتا تھا تو اس کا یہ مسکن تھا۔ مگر مجھے نہ تو اس زمانے میں اتنی سمجھ تھی اور نہ ہی اس موضوع پر عبور تھا کہ کوئی قدیم زمانے کی علامات تلاش کرتا۔ یہ بات ۱۹۴۲ء کی ہے! اب اس مقام پر محکمۂ آثار قدیمہ عراق نے تمدن کے قدیم ترین آثار ڈھونڈھ نکالے ہیں۔ اس غار کا نام پلگوڑا ہے اور سلیمانیہ سے دس میل مشرق کی طرف واقع ہے۔ اب جو اس غار سے متعلق تحقیق مکمل ہوئی تو ثابت ہوا کہ یہ غار آج سے دس ہزار برس پہلے آباد تھا۔ اس میں سے متعدد چقماق کے ٹکڑے نکلے ہیں جس کی وجہ سے اس غار کو اس صفت کا پہلا مرکز قرار دیا جاتا ہے یہاں کی آبادی پتھر کے زمانے کے اواخر کی ہے۔ اس کے بعد تہذیب نے دوسرا متمدن رنگ اختیار کیا۔ چقماق ایک پختہ قسم کا پتھر ہے جس میں لوہے جیسی جھنکار ہوتی ہے اور قدیم زمانے میں اس کو ہتھیار بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ چقماق کے ہتھیار پاکستان میں متعدد جگہوں پر دستیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً وادیٔ سوہان، روہڑی، خیرپور وغیرہ ہیں۔ قدیم تہذیبیں جس جس مقام پر واقع ہوئی ہیں وہاں اکثر زمین پتھریلی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ اینٹیں مٹی سے بنائی جاتی تھیں انکو سورج کی روشنی میں پختہ کیا جاتا تھا۔ یا پھر بعد میں آگ کے بھٹوں میں۔ مثلاً بابل، کلدان، مصر موہنجوداڑو، ہڑپا وغیرہ مقامات پر پتھر نہیں ہوتا خصوصاً وہ پتھر جسکو چقماق کہتے ہیں یہ باہر سے بن کر جایا کرتا تھا۔ بابل اور کلدان میں پتھر کے ہتھیار موصل اور نینوا کے گرد و نواح سے آتے تھے، موہنجوداڑو اور ہڑپا میں یہ ہتھیار پٹھوار اور روہڑی سے بن کر آتے تھے

Marfat.com

گویا چقماق کا علاقہ اوّلین انسان کا علاقہ تھا، لیکن بعدہٗ جب انسان متمدن ہو کر مہذب ہو گیا تو وہ نیچے دریاؤں کے دہانوں پر جا بسا۔ جہاں سے وہ نقل و حرکت کر کے تجارت کر سکتا تھا۔ پتھر کے زمانے میں انسان غیر متمدن تھا۔

عراق کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے ایک اور مقام پر جس کا نام پروہ بلکا ہے کچھ ناپید جانوروں کی ہڈیاں بھی تلاش کی ہیں اور کچھ پتھر کے ہتھیار بھی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ آخری برفانی دور (GLACIAL AGE.) کے زمانے کی چیزیں ہیں۔ اور ان کا زمانہ آج سے تقریباً ایک لاکھ سال پہلے کا زمانہ ہے۔ یہ تحقیقات زیادہ تر زمینی یعنی (GEOLOGICAL تحقیقات سے متعلق ہیں۔

پروہ بلکا کی تہذیب سے یہ بخوبی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب انسان کے پاس بہت ادنےٰ قسم کے ہتھیار ہوا کرتے تھے جو وہ پتھر سے بناتا تھا۔ اور اس کی گذر اوقات محض شکار پر تھی۔ اس کے گرد و پیش میں ایسے ہاتھی رہتے تھے جو آج کل ناپید ہیں۔ اور وہ ہرن جو ہاتھی کی مانند ہوا کرتے تھے وہ بھی اس کرۂ ارضی سے ناپید ہو چکے ہیں۔ زمین کی سطحی ساخت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہاں پر لوگ یکے بعد دیگرے آکر آباد ہوئے۔ .... بلگدار ا کے باشندے چقماق سے چاقو اور تیز ہتھیار بنانے میں اچھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔ اور یہ تیز پتھر وہ اپنے تیروں کی نوکوں پر لگایا کرتے تھے۔ تاکہ شکار اور جنگ میں سہولت ہو۔ یہ لوگ بہت اچھے شکاری ہوا کرتے تھے۔

کریم شہیر کی بستی میں زیادہ آثار نہیں ملے۔ البتہ بکھرے ہوئے مکان جن کے فرش پختہ بنے ہوئے تھے کہیں کہیں ملے ہیں۔ کہیں کہیں چولھے بھی ملے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اس دور میں انسان خوراک کے معاملہ میں کافی مہذب ہو چکا تھا۔ ایک آدھ گھڑا بھی ان آثار میں ملا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ساز و سامان اشیائے خوردنی کو محفوظ

Marfat.com

رکھنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ لوگ گوشت خور تھے کیونکہ گھروں میں ہڈیاں بکثرت پائی گئی ہیں مگر ابھی یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی کہ ان کے ہاں پالتو جانور بھی ہوتے تھے کہ نہیں۔ ممکن ہے ابھی انسان نے یہ فن نہ سیکھا ہو۔ جانور کو سدھا کر پالتو بنانا تمدن کی تاریخ میں بہت بعد کی اختراع ہے۔ رشتۂ زوجیت قائم ہو جانے کے بعد سب سے پہلے عورت نے مرد کو گھر بنایا تھا۔ اس کے بعد مرد نے جانوروں کو سدھانا شروع کیا اور اس کو پالتو بنایا۔ اس مقام پر پتھر کے کچھ زیورات بھی ملے ہیں مثلاً ہاتھوں کے بریسلیٹ اور گلے کے طوق۔ کانسے کے ہتھیار بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ مگر ریڈیو ایکٹو ٹسٹ سے یہ پتہ نہیں چلایا جا سکا کہ یہ کس زمانے کے ہتھیار یا زیورات ہیں۔ بہرحال یہ واضح ہے کہ کریم شہیر کا کلچر ایک ایسے دور سے تعلق رکھتا ہے جو بلگوار اغار اور جرمو کے کلچروں کے بین بین ہے۔

قلعہ جرمو گو ایک مختصر سی آبادی ہے مگر ان انکشافات کی بنا پر جو یہاں سے برآمد ہوئی ہیں اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہاں پر کوئی ہتھیار ایسا نہیں ملا جو آہنی ہو اور نہ ہی کوئی ایسے ظروف ملے ہیں جن کی کچھ بھی تاریخی وقعت ہو۔ تاہم یہاں کے لوگ ایسے مکانات بناتے تھے جن میں متعدد کمرے رہائش کے لئے ہوا کرتے تھے۔ انکی دیواریں مٹی کی ہوتی تھیں۔ ان کے اندر چولہے جابجا دیکھنے میں آتے ہیں۔ بعض کمروں میں چولہوں کے ساتھ چمنیاں بھی بنی ہوئی ہیں۔ مٹی کے برتنوں کی جگہ پتھر کے ظروف ملے ہیں۔ مٹی کی مورتیاں بھی پائی گئی ہیں جو یا تو جانوروں کی شکلیں ہیں یا پھر دیوتاؤں کی مورتیاں ہیں۔ چقماق عام پایا گیا ہے۔ ہڈیوں سے پتہ چلتا ہے کہ اسّی فیصد جانور۔ گائے بھینس، گھوڑا اور بکری ہوا کرتے تھے۔ گویا اس آبادی میں جانور پالتو بنایا جا چکا تھا۔ گیہوں کی دو قسمیں مل چکی ہیں۔ عام طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی معاشی حالت اچھی تھی۔ اور کچھ گھریلو صنعتیں بھی وجود میں آ چکی تھیں۔ شہری زندگی بہت حد تک ترقی کر چکی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ سیاسی۔ معاشی اور اخلاقی انتظامات کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ گویا انسان جو

Marfat.com

غاروں کا غیر متمدن باشندہ تھا اب متمدن ہو کر شہری زندگی اختیار کر چکا تھا۔

اب آپ اس تفصیل کے بعد اصل کتاب ملاحظہ فرمائیے۔ اور اس تمہید کو اصل کتاب کا تتمہ سمجھنا چاہیئے کہ اصل کتاب اور اس مقدمہ کے لکھنے کے درمیان پندرہ برس کا فاصلہ ہے لہٰذا جو اہم تحقیق اس دوران میں ہوئی وہ اس مقدمہ میں اختصاراً پیش کر دی گئی ہے۔ یہاں ایک آخری لفظ نامناسب نہ ہوگا۔ اور وہ یہ کہ اگرچہ کتاب کی اشاعت کا سہرا مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے سر ہے۔ اس کتاب کی لغزشوں کے وہ ذمہ دار نہیں۔ یہ تمام تر میری ذمہ داری ہے۔ احباب سے گذارش ہے کہ ان کو درگذر فرما کر راقم السطور کے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔

کراچی (۴ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ) خواجہ عبدالرشید

Marfat.com

پیش لفظ

دنیاوی علوم میں تاریخِ قدیم ایک ایسا موضوع ہے جس سے نہ صرف ہمیں گذشتہ اقوام کے حالات ہی معلوم ہوتے ہیں بلکہ ان کا انجام دیکھ کر ایک عبرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ جس دن سے اللہ تعالےٰ نے اس کرۂ ارض کی تخلیق فرمائی ہے اسی دن سے اس کے لئے قوانین بھی مقرر کر دیئے ہیں۔ ہمارا مشاہدہ یہی بتاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے قوانین خواہ وہ انسان کے لئے ہوں یا حیوان کے لئے۔ سب کے سب اٹل ہیں اور ان میں ردوبدل نہیں ہوا کرتا۔ اس دنیا میں ایک ذرہ بھی موجود نہیں، جو اللہ تعالےٰ کے کسی نہ کسی قانون کی زد میں نہ ہو۔ اللہ تعالےٰ نے جب قوانین بنائے تو ان کا مقصد یہ تھا کہ نظامِ تخلیق میں ایک دائمی ضبط پیدا کر دیا جائے۔ اگر یہ قوانین موجود نہ ہوں تو دنیاوی نظام درہم برہم ہو جائے۔ اس لئے فرمایا کہ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا۔ یہ جو اللہ تعالےٰ نے چاند، سورج اور ستارے بنائے، تو اس تمام نظامِ شمسی کے لئے قوانین موجود ہیں۔ اسی طرح نباتات، معدنیات کی دنیا میں بھی قوانین موجود ہیں جو ایک مناسب موزونیت رکھتے ہیں تاکہ ان مختلف نظاموں میں برہمی اور افراط و تفریط نہ پیدا ہو جائے۔ اور اسی طرح انسانوں کے لئے بھی قوانین موجود ہیں، جو ان کی معاشرتی اور اخلاقی زندگی کو ضبط میں رکھتے ہیں تاکہ اس میں برہمی نہ پیدا ہو جائے۔ گویا حیوانات، نباتات اور معدنیات کے لئے جو قوانین ہیں تو یہی ان کی تقدیر ہے جو بدل نہیں سکتی۔ انسان اور دیگر مخلوقات کے بھی قوانین ہیں۔ یہ اگرچہ بدلتے نہیں ہیں، تاہم اللہ تعالےٰ کے قانونِ ارتقاء کے مطابق ان میں وقت کے مطابق ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ بھی قانونِ الٰہی ہے کہ ایسا ضرور ہو۔ اوّل اوّل جب یہ کائنات ارتقاء کے مرحلوں

Marfat.com

سے گذر رہی تھی تو اس وقت اس قدر ترقی نہ ہوئی تھی کہ مزید نشوونما اور ارتقاء روک لیا جاتا۔ بلکہ ارتقاء کا منشاء ہی یہی تھا کہ ایک چیز ترقی کرتی کرتی اپنی خصوصیات اور خصائل میں مکمل ہو جائے۔ اور جس وقت وہ ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے تو پھر اس کے لئے جو دائمی قوانین ہیں وہ مقرر کر دیئے جائیں۔ یہ امر تخلیق کے جاری رہنے کے لئے ضروری تھا۔ اور ایسا ہی ہوا اور ہو رہا ہے۔ اوّل اوّل انسان کا بھی ذہنی ارتقاء اپنی پہلی منزلوں پر تھا اس لئے لازم تھا کہ اس کے لئے قوانین بھی ایسے ہوتے جو اس کے ناقص اور نامکمل ذہن میں بہ آسانی اتر جاتے اور ان میں کوئی الجھاؤ پیدا ہونے کا امکان نہ رہتا۔ تو جب انسانی ذہن ترقی کرتا گیا پھر اللہ تعالےٰ کے قوانین میں بھی اس کے لئے ترمیم کر دی جاتی رہی یہاں تک کہ جب انسانی ذہن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں انتہائی ترقی کر گیا اور ہر حالت میں مکمل ہو گیا تو اللہ تعالےٰ نے ایک مکمل قانون آپ کے ذریعہ پیش کیا جو دائمی قانون تھا اور دنیا کے ہر گوشے کے لئے یکساں طور پر مفید تھا۔ اس قانون میں کسی قسم کی ترمیم کی گنجائش نہیں۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزماں کہلائے اور جو قانون وہ لائے وہ ایک آخری اور مکمل قانون شریعت تھا جس نے آخر دنیا تک قائم رہنا ہے اور اس آخری قانون کا نام اسلام ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (ترجمہ) آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل
وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے پسند کیا دین
رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا اسلام کو!

یہی وہ قانون الٰہی ہے جس کے ارتقاء کی تکمیل اسلام میں ہوئی۔ آپ آم کا درخت بوتے ہیں تو پہلے گٹھلی زمین میں ڈالتے ہیں وہ ایک خاص قانون کے مطابق پھوٹتی ہے۔ پھر آپ پانی دے کر اس کو سینچتے ہیں اور وہ درخت کی شکل اختیار کرتا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک وقت آئے گا جب اس آم کے درخت کی تکمیل ہو جائے گی اور اس کی مزید نشوونما رک جائے گی اور یہ پھل دینے لگے گا۔

Marfat.com

بعینہٖ یہی حالت اللہ تعالےٰ کے قانون کی ہے۔ صراطِ مستقیم اس مکمل قانون کا نام ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اور اسی پر چل کر دنیا پھل پھول سکتی ہے۔ اور اگر کوئی اس قانون کے علاوہ کوئی راہ اور اپنے لئے تجویز کرے گا تو وہ پھر حاکم کے قانون کی گرفت میں ہوگا اور خمیازہ اُٹھائے گا۔ اس سے بچاؤ ناممکن ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ	اور جو کوئی اسلام کے سوا (جو عالمگیر سچائی اور تصدیق کی راہ
الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ	ہے) کوئی دوسرا دین چاہے گا تو یاد رکھو، اسکی راہ کبھی قبول نہ ہوگی
يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي	اور وہ آخرت میں دیکھے گا اس کی جگہ گھاٹے والوں میں نہیں، بلکہ
الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝	نقصان اُٹھانے والوں میں ہے!

ہمارا ہر روز کا مشاہدہ ہے کہ ہمارے ملکی قانون کی خلاف ورزی کر کے حکومت کے پنجے سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تو پھر کیوں تعجب ہو کہ ایک بہت وسیع اور عالمگیر قانون کی گرفت سے ہم اس کی خلاف ورزی کر کے نکل جا سکتے ہیں۔ جب ہم ان قوانین کے تحت افراد کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں بکثرت ایسے ملتے ہیں جو راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ اور جب اقوام کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو کئی قومیں بھی بھٹکی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ جس طرح افراد کے لئے قوانین موجود ہیں اسی طرح اقوام کے لئے بھی موجود ہیں۔ اور یہ انھیں اقوام کی کچھ تاریخ ہے جو ہم قارئینِ کرام کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ جنھوں نے قانونِ الٰہی کو جھٹلایا اور ضد میں آکر انکار کر دیا ہمیں آسمانی صحائف میں بھی اس قسم کی داستانیں مل جاتی ہیں جو ان اقوام کے متعلق ہیں جنھوں نے قانونِ الٰہی کو قبول کرنے سے انکار کیا اور وہ تباہ و برباد ہو گئیں جہاں جہاں اور جس جس آسمانی صحیفے میں ان اقوام کا اور ان کے انجام کا ذکر ہے وہاں جا بجا یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ ان کی نافرمانی کیا ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح یہ سلسلہ ان صحائف میں شامل کر لیا گیا جو بعد میں نازل ہوئے تاکہ آئندہ آنے والی قومیں متنبہ ہو جائیں۔

تاریخِ قدیم سے متعلق جسقدر بھی روایات ان گذشتہ اقوام سے متعلق تھیں، وہ الٰہی آسمانی

Marfat.com

صحیفوں سے ہی اخذ شدہ تھیں۔ ان پر ایمان لانا ایک یقینی امر تھا کیونکہ یہ الہامی کتابوں میں موجود تھیں۔ گذشتہ ایک سو سال میں علمِ آثارِ قدیمہ اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ اس نے ان میں سے اکثر اقوام کے وقوع کو بہ عملِ تنقیب برآمد کر دیا ہے اور اب یہ تمام روایات ہمارے سامنے روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی ہیں اور وہ جو پڑھی سنی باتیں تھیں ان کی تصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم ان مقامات کا مطالعہ اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں۔ ان تحقیقات کی بنا پر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہی ایک دلیل کافی ہے اس امر کے لئے کہ دینِ حقیقی جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مختلف وقتوں اور مختلف اقوام کے سامنے پیش کرتے رہے۔ وہ واقعی ایک حقیقت ہے۔ اور اس میں شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ تاریخِ قدیم کا سب سے پرانا سرچشمہ آسمانی صحائف ہی ہیں آثارِ قدیمہ اب ان کی تصدیق کر رہے ہیں۔ گویا یہ متشابہات کا محکمات بن جانا یہاں ایک بیّن ثبوت ہے۔

اکثر مقامات جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے ہم نے خود دیکھے ہیں اور ان کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ چند مقامات پر ذاتی طور سے بھی کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے اور جو کچھ وہاں سے حاصل ہوا وہ سب قلمبند کر دیا ہے۔ چند نظریے ذاتی ہیں جو قابلِ تنقید ہیں۔ جوں جوں تنقیب سے اور اور انکشاف ہوگا، لازم ہے کہ نظریوں میں ترمیم کرنا پڑے۔ اور مزید تاریخی پہلو برآمد ہوتے رہیں۔ تاہم اس وقت کی تحقیق کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نظریئے غیر مستند نہیں۔ اس کتاب کے لکھنے سے مقصد بھی یہی تھا کہ علمی دنیا کے سامنے جدید تحقیق کی روشنی میں تاریخِ قدیم کو پیش کر دیا جائے۔ عوام میں اس موضوع کا شوق بہت کم نظر آتا ہے۔ ہمارے نزدیک مذہبی پہلو سے یہ موضوع نہایت اہم ہے کیونکہ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات جو تاریخِ قدیم سے متعلق ہیں ان کی تشریح بخوبی کی جا سکتی ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں ہمیں مختلف کتابوں سے مدد لینا پڑی۔ لیکن افسوس سے

Marfat.com

کہنا پڑتا ہے کہ اس موضوع پر ہماری زبان میں کوئی بھی مستند کتاب موجود نہیں۔ صرف چند کتابوں میں جستہ جستہ ذکر اس موضوع پر ملتا ہے لیکن وہ اس قدر مختصر اور سطحی ہے کہ اس سے افادہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ترجمان القرآن جلد دوم میں شدہ شدہ تذکرہ تاریخ قدیم پر موجود ہے۔ لیکن وہاں بھی زیادہ زور تاریخ ایران پر ہے۔ ہمارے موضوع سے متعلق اس میں کوئی تفصیل موجود نہیں۔ ارض القرآن (مصنفہ سید سلیمان ندوی) جلد اوّل میں کوشش کی گئی ہے کہ ان امور کی طرف اشارہ کیا جائے جہاں جہاں ان کا تعلق قرآنی تاریخ سے ہے مگر افسوس کہ یہاں بھی مولانا نے مختلف کتابوں سے مختصر سے اقتباسات پر اکتفا کیا ہے۔ ذاتی تحقیق کوئی موجود نہیں۔ اور پھر ان میں زیادہ مواد ایسا ہے جو پرانا ہو چکا ہے اور جدید تحقیق کی نگاہ میں قابلِ اعتبار نہیں۔ ہم نے جہاں جہاں مناسب سمجھا ارض القرآن کے کچھ بیانات کی ترمیم کر دی ہے۔ اور جو جو مفید باتیں تھیں ان کو بالتفصیل مع حوالہ جات قلمبند کر دیا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تصنیف قصص القرآن بھی ہماری نگاہ سے گزری ہے۔ اگرچہ ہمارے موضوع کے ساتھ اس کا کچھ تعلق نہیں تاہم جہاں جہاں قدیم تاریخ کے قصص کا تعلق ہے اس سے بہتر کتاب اردو زبان میں نہیں لکھی گئی۔ ہم نے اس سے بھی استفادہ کیا ہے اور کچھ اقتباسات درج کئے ہیں۔

عربی اور فارسی میں بھی یہ موضوع ناپید ہے۔ البتہ بغداد کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے چند رسالے شائع کئے ہیں جو ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ مگر ان میں بھی ان کی کچھ ذاتی جستجو اور تحقیق کو دخل نہیں۔ پرانی کتب میں جو معلومات محفوظ ہیں ان کو عملِ تنقیب کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں۔ اور یہ تمام روایات پرانی ہو چکی ہیں۔ فارسی زبان میں دو تین کتابیں ہماری نگاہ سے گزری ہیں۔ مگر یہ زیادہ تر تاریخ ایران سے متعلق ہیں اور ان میں زردشتی تہذیب کا زیادہ تذکرہ ہے۔ ایک اور رسالہ ہماری نگاہ سے حال

Marfat.com

ہی میں گذرا ہے۔ جس کا ذکر ہم نے آخری باب میں کر دیا ہے۔ یہ رسالہ پچھلی صدی کے آخر میں شائع ہوا۔ اس میں زیادہ تر بحث طوفانِ نوح سے متعلق ہے اگرچہ کتابات میخی کا بھی متعدد مقامات پر ذکر ملتا ہے۔ انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی میں متعدد کتابیں اس موضوع پر دستیاب ہوتی ہیں اور ہم نے اکثر انہی سے استفادہ کیا ہے اور جا بجا ان کے حوالہ جات دے دیئے ہیں۔ جن احباب کو اس موضوع پر مزید تحقیق و مطالعہ کا شوق ہو وہ ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مختصر سی کتاب میں جو معلومات ہم نے بہم پہنچا دی ہیں انھیں اول ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں یکجا کیا گیا تھا۔ اور اس وقت تک کی جتنی تحقیق ہے وہ سب اس میں آگئی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جنگِ عظیم دوم اپنے عروج پر تھی اور ہمیں اس سلسلے میں مشرقِ وسطیٰ کی صحرانوردی کا اتفاق ہوا، دوبارہ ۱۹۵۱ء میں پھر اُدھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس مرتبہ قیام مختصر تھا اور عملی طور پر کسی تاریخی مہم میں حصہ نہ لے سکے تاہم جو جو انکشافات ہمارے ورود کے بعد وقوع پذیر ہوئے ان تمام کو ہم نے مقدمے کی شکل میں تحقیقِ جدید کے تحت درج کر دیا ہے تاکہ یہ سلسلۂ تحقیق مکمل ہو جائے۔ اس عرصہ میں کچھ نہ کچھ کام وادیِ سندھ میں ہوا، مگر وہاں سے برآمد شدہ نتائج تسلی بخش نہیں۔ اور تحقیق کا ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا یہ جہاں آج سے چالیس برس پہلے تھی اب بھی وہیں ہے۔ بڑی دلچسپی وہاں کی تہذیب سے متعلق پیش آرہی ہے یہ ہے کہ جو زبان دریافت کی گئی ہے اس کا حل ابھی تک نہیں مل سکا، اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم قطعی طور پر ہلالِ خصیب کی تہذیب سے اس کی مناسبت قائم نہیں کر سکے۔ پاکستان میں اب اس موضوع سے کچھ نہ کچھ دلچسپی لی جا رہی ہے۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ جتنی اہمیت اسے دینا چاہیئے تھی وہ اسے نہیں مل رہی۔

(خواجہ عبدالرشید)

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب (۱) اوّل

ہلالِ خصیب[1] اور وادئ سندھ

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ
رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا
الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَی اللّٰہُ وَمِنْهُمْ
مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْہِ الضَّلٰلَۃُ فَسِیْرُوْا
فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ
عَاقِبَۃُ الْمُکَذِّبِیْنَ ؁

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (دنیا کی) ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا (تاکہ اس پیغامِ حق کا اعلان کرے) کہ اللہ کی بندگی کرو، اور سرکش قوتوں سے بچو۔ پھر ان امتوں میں سے بعض ایسی تھیں جنہیں اللہ نے کامیابی کی راہ کھول دی، بعض ایسی تھیں جن پر گمراہی ثابت ہو گئی پس ملکوں کی سیر کرو اور دیکھو جو (سچائی) کی جھٹلانے والی تھیں انہیں بالآخر کیسا نتیجہ پیش آیا!

کئی ہزار سال کا واقعہ ہے، جب بابل اور سندھ کے میدان آہستہ آہستہ بننے شروع ہوئے۔ شمال کی طرف سے جو دریا آنے والے تھے وہ اپنے ساتھ نہایت زرخیز مٹی بہاتے لاتے اور بڑی عمدگی کے ساتھ ان میدانوں میں بچھا دیتے، اور یہ سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا۔ یہاں تک

---

[1] ہم نے یہ ترجمہ FERTILE CRESCENT کا کیا ہے اور اس طرح ایک نئی اصطلاح سے تعارف کرا دیا ہے۔ اس کے حدودِ اربعہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کیجئے۔ یہ خطہ نہایت زرخیز ہے اور اسی میں دنیا کی تمام قدیم تہذیبیں پھلی پھولی ہیں۔ اس اصطلاح کو پہلی دفعہ انگریزی زبان میں بریسٹڈ BREASTED نے استعمال کیا تھا۔ ہم نے اسی سے مستعار لیا ہے۔

Marfat.com

کہ یہ علاقے اس قدر زرخیز ہو گئے کہ ان کی شہرت دور دراز تک پہنچ گئی۔ یہ میدان وادی نیل کے میدانوں سے بہت پہلے بنے۔ اور جب یہ عراق اور سندھ کے شمالی پہاڑی سلسلوں سے دائمی برف پگھلنا شروع ہوئی تو پانی اسقدر افراط سے بہا کرتا تھا کہ مٹی کے انبار ساتھ لے آتا۔ اوّل اوّل یہ تمام علاقے برف کے نیچے دبے ہوئے رہتے تھے۔ قیاس اس وقفے کا اندازہ صحیح طور پر نہیں لگا سکتا۔ تاہم ایک مدتِ دراز ہو چکی جبکہ شمالی سلسلۂ کوہستانی دائمی طور پر برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ یہ وقت آئس ایج (ICE AGE) کا تھا۔ مگر پھر موسموں کے تغیر نے ان کو آہستہ آہستہ صاف کر دیا اور ان سے جو پانی بہا وہ اپنے ساتھ تمام علاقوں کی

ہلالِ خصیب کا نقشہ

Marfat.com

مٹی بہا نا لے گیا اور سمندر سے گرنے سے پیشتر اس کو اس طرح بچھا دیا کہ وہاں پر ایک نہایت اعلےٰ قسم کا میدان جو کہ نہایت زرخیز تھا اور کاشتکاروں کے لئے بہشت کا نمونہ تھا چھوڑ گیا۔

ہلالِ خصیب کا محلِ وقوع کچھ نصف دائرے کی طرح ہے جیسا کہ اس کا نام بتا رہا ہے۔ سکندر مقدونی کے بعد اس علاقے کے کچھ حصہ کو میسوپوٹامیا MESOPOTAEMIA کہا جاتا تھا۔ اس ہلال کا کھلا حصہ جنوب کی طرف ہے، اس کے مغرب کی طرف بحرِ متوسط کا مشرقی کنارہ ہے اور اس کا وسط حجاز عرب کا عین شمال اور جو مشرقی حد ہے وہ خلیج فارس کے ساتھ ٹکراتی۔ دنیا کی سب سے قدیم تہذیبیں اسی ہلال سے نمودار ہو رہی ہیں۔

موجودہ صدی میں وادیٔ سندھ میں بھی دو تین مقامات پر اہم انکشافات ہو چکے ہیں اور اس علاقے کی تہذیب بھی بہت قدیم ثابت ہو چکی ہے ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے ان دونوں علاقوں میں کچھ مناسبت پائی ہے جو کہ تاریخ کے لحاظ سے بہت اہم ہے، مگر فی الحال یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مستشرقین کو ایسے انکشافات سے کہاں تک اتفاق ہو۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ انکشافات نہایت دلچسپ اور قابلِ غور ہیں۔

"(HUXLEY) ہکسلے اپنے مضامین میں تاریخ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ سائنس دنیا کو یہ سکھا رہی ہے کہ اپیل کی آخری عدالت مشاہدہ اور تجربہ ہے نہ کہ سند!"

ہماری رائے میں ایک نہایت لطیف نکتہ ہے جو انھوں نے بیان کیا ہے۔ جدید انکشافات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسناد اور اخراج المدفون کا عمل دو بالکل متضاد چیزیں ہیں، جب وقت کسی دفن شدہ قدیم تہذیب کا اخراج کیا جاتا ہے تو ماہرینِ فنِ اوّل تو سنی سنائی باتوں پر عمل کرتے ہیں، یا ایسے علاقوں کا تجربہ کی بناء پر ایک سطحی مشاہدہ کر کے اپنا عمل شروع کر جاتے ہیں اور جس وقت خاطر خواہ انجام حاصل ہو جاتا ہے تو بعد میں اس تہذیب کا وقت

Marfat.com

تعین کرنے کے لئے اسناد کی تلاش شروع ہوتی ہے چنانچہ حاصل شدہ کتبوں اور دیگر اشیاء سے جو دوسرے مقامات سے ظاہر ہوتے ہیں مناسبت قائم کرلی جاتی ہے۔

درحقیقت قدیم تاریخ کا حل ایک نہایت سست رفتار عمل ہے اور وجہ اس تساہل کی یہ ہے کہ مختلف ماہرین فن جو بیک وقت مختلف مقامات پر مصروف کار ہوتے ہیں ذاتی طور پر اگر ان کے ہاتھ کچھ لگ جائے تو ان کی تفصیل اس چیز کے متعلق کچھ مختلف ہوتی ہے، یعنی دیگر انکشافات سے اس کا تطابق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب تک کہ تمام کارروائی شائع نہ ہو جائے اور ماہرین مل کر کسی ایک نتیجہ پر نہ پہنچ جائیں۔ اس وقت تک یہ اختلافات دور نہیں ہو سکتے مگر پھر ایک دوسرے کو پرکھنے کے لئے کوئی سند موجود نہیں ہوتی۔ جو چیز اس بات پر یقین کرتی ہے وہ ذاتی یا انفرادی مشاہدہ اور تجربہ ہوتا ہے یا اگر کوئی کتبہ یا مجسمہ ہاتھ لگ جائے جس میں تمام راز کی کلید موجود ہو۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ ہمارا مقصد صرف اتنا تھا کہ یہ جو مناسبت ہلالِ خصیب اور وادیٔ سندھ کی تہذیبوں میں پائی گئی ہے، انکو درست یا غلط ثابت کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ البتہ وقت گذرنے پر مشاہدہ اور تجربہ خود بخود ماہرین کے سامنے سند پیش کر دیگا اسی لئے ان میں سے جو کچھ بھی آج تک ثابت ہو چکا ہے۔ اس کو غلط کہنا عقلمندی نہیں۔ ماہرین آثارِ قدیمہ نے اس وقت تک بے شمار کام کر دیا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ گذشتہ تاریخ کے جو واقعات صرف بطور قصے اور کہانیاں معلوم تھے۔ انھوں نے ان کو سامنے لاکر پیش کر دیا ہے۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس قدر بھی قدیم آثار ہمیں ملے ہیں یہ اس طرح کیوں تباہ و برباد ہو گئے؟

135122

ماہرین فن اس کی تین وجوہات بیان کرتے ہیں:

اوّل یہ کہ مقامات زلزلوں کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔

دوم یہ کہ حملہ آور فوجوں نے تباہ و برباد کر دیا ہو یا آگ لگا دی ہو۔

Marfat.com

سوئم :- یہ کہ اچانک کوئی وبا پھیل جائے جس طرح گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد ہوا تھا -

یہ تینوں دلائل بہت خوب ہیں اور ان کے ثبوت بھی مل چکے ہیں۔ مثلاً آگ سے تباہ ہونے کے آثار نمرود اور آشور (قلعہ شرکت) میں ملے - عمارات تمام جلی ہوئی اور سیاہ تھیں۔ اللہ تعالے کی شان ہے یہ کہ جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا، وہ خود جل کر راکھ ہو گیا -

وَإِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا (بنی اسرائیل)

اور روزِ قیامت سے پہلے ضرور ایسا ہونے والا ہے کہ (نافرمانوں) کی جتنی بستیاں ہیں ہم انھیں ہلاک کردیں یا عذابِ سخت میں مبتلا کردیں یہ بات (قانونِ الٰہی) کے نوشتہ میں لکھی جا چکی ہے!

اور جب مختلف کتبات برآمد ہوئے جو دوسرے علاقوں سے ملے تو ان میں ان تمام بربادیوں کا حال درج ہوتا تھا - اکثر ایسا ہوتا چلا آیا ہے کہ ایک مقام سے ایک فوج چلتی اور دوسرے مقام پر حملہ آور ہو دیتی شہر کو تباہ و برباد کرکے جب واپس لوٹتے تو اسیر قیدی سے لکھے جاتے اور وہ محفوظ رہتے - اسی طرح زلزلوں سے بھی مقامات تباہ ہوئے جیسے پومپیائی (POMPII) غرضیکہ اسی قسم کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں - مگر ہم کو اس وقت ان تمام دلائل سے جو ماہرینِ فن پیش کرتے ہیں، شدید اختلاف ہے، ہم بستیوں کے نیست و نابود ہو جانے کی وجہ صرف ایک جانتے ہیں - اور وہ قہرِ الٰہی ہے - مستشرقین نے جو دلائل دیئے ہیں وہ بہت حد تک درست ہیں مگر ان وجوہات کے باعث جو تباہی و بربادی ہوا کرتی ہے وہ عارضی ہوتی ہے اور ایک قلیل عرصہ کے بعد وہاں پھر تہذیب و تمدن شروع ہو جاتا ہے - مستشرقین نے جو تین وجوہات بیان کی ہیں انھی کی بنا پر بابل کئی مرتبہ تباہ و برباد ہوا، مگر بار دگر پیدا شد لیکن جب وقت عذابِ الٰہی نے آگھیرا تو پھر دوبارہ کھڑا نہ ہو سکا ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گیا -

Marfat.com

درحقیقت اقوام کی تباہی دو قسم کی ہوا کرتی ہے۔ ایک عارضی اور دوسری مستقل مستقل تباہی میں قوم اور اس کی تہذیب یک قلم معدوم ہو جاتی ہے لیکن عارضی تباہی میں معدوم نہیں ہوتی بلکہ ایک عرصہ کے لئے اس کی مزید نشوونما رک جاتی ہے اور کوئی دوسری قوم اس پر غالب آ جاتی ہے قرآنِ کریم میں جو وجوہات اقوام کی تباہی سے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ وہ مختصر طور پر یہ ہیں

اوّل ایک قوم جب ترقی کر جائے تو اس میں غرور و تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ دوئم اس غرور و تکبر میں آکر وہ ظلم کرنا شروع کر دیتی ہے اور سوئم جب ظلم و ستم کی انتہا ہو جاتی ہے تو وہ قوم اللہ تعالےٰ کی ہستی سے منکر ہو جاتی ہے اور بت پرستی شروع کر دیتی ہے۔ اور بالآخر گمراہی میں پھنس کر یہ کہدیتی ہے مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً ! یعنی قوت اور زور میں ہم سے کون بڑا ہے !!! اور اسی طرح جب اللہ تعالےٰ کی ہستی سے انکار کرتے ہیں تو خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں۔ اور جب وہ انھیں صراطِ مستقیم پر لانا چاہتے ہیں تو کہدیتے ہیں۔ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۔ یعنی ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ تو گویا یہ وہ وجوہات ہیں جنکی وجہ سے اللہ تعالےٰ کا عذاب ان پر نازل ہوا اب رہا یہ سوال کہ قہرِ الٰہی کس شکل میں ظاہر ہوتا ہے تو اس کی تشریح بھی قرآنِ کریم نے جابجا قصص و امثال میں کر دی ہے۔ ان تمام وجوہات میں زلزلے، وبائیں اور آندھیاں اور طوفان وغیرہ سب سے نمایاں ہیں۔

انہی وجوہات کو مدِنظر رکھ کر ہم نے تین وجوہات اخذ کی ہیں جو ابھی مذکورہ بالا میں اختصاراً عرض کر دی ہیں اور ان تمام وجوہات کا لب لباب ہماری نگاہ میں صرف ایک ہی ہے اور وہ قہرِ الٰہی ہے۔ باقی رہی قوموں کی عارضی تباہی تو وہ بھی اللہ تعالےٰ کے قانون کے مطابق ہی کہ وہ قوموں پر ان کے دن پھیرتا رہتا ہے۔

یہاں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غرور و تکبر اور ظلم و ستم ایک قوم صرف اسی وقت اختیار کر سکتی ہے۔ جب اس کا ایمان کمزور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایمان کی یہ صفت ہے۔ کہ اوامر

Marfat.com

اور قوم میں ایک حقیقی عبودیت اور انکساری پیدا کر دیتا ہے جس شخص میں ایمان کی قوت موجود و محفوظ ہوگی۔ اس میں تکبر، ظلم اور ستم کا شائبہ بھی نظر نہیں آسکتا۔ یہ اس لئے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ہر وقت اور ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھے گا اور اللہ تعالیٰ کا رعب اس کے رگ و ریشے میں سمایا ہوا ہوگا۔ لہٰذا یہ تمام نقائص صرف اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب ایمان باللہ مفقود ہو جائے اور جب ایسی حالت طاری ہو جائے تو اخلاق بھی گر جاتا ہے اور جس قوم کا اخلاق ہی گر گیا تو پھر اس قوم کے گرنے میں دیر نہیں لگتی۔

ویساً بامرا بنیان قوم

اذا اخلاقہم کانت خرابا

بادشاہوں نے ہمیشہ سے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ ایک آتا، لوٹ کھسوٹ کرتا اور تباہ و برباد کرتا چلا جاتا۔ دوسرا پھر اور آتا تو اس کو آباد کر دیتا۔ دنیا میں ہزار ہا شہر ایسے ہونگے جو بادشاہوں کے ہاتھ سے تباہ ہوئے مگر پھر انکی تعمیر از سر نو ہو جاتی۔ زلزلے بھی آتے مگر شہر پھر آباد ہو جاتے۔ دور کیوں جایئے کوئٹہ ہی کو دیکھ لیجئے اگرچہ وہ شان و شوکت نہیں، تاہم معدوم نہیں ہوا۔ تجارت آمد رفت اور آبادی اسی طرح ہے البتہ مکانوں کی ساخت میں فرق ضرور آگیا ہے۔

ہمارا اس تمام تفصیل سے مدعا یہ بتانا تھا کہ جو دلائل و وجوہات ماہرین آثار قدیمہ ان مقامات کے تباہ و برباد ہونے کے بیان کرتے ہیں وہ غلط ہیں۔ تباہ وہی مقامات ہوتے ہیں جو منشاء الٰہی میں ہوں۔ ورنہ وہ پھر آباد ہو جاتے ہیں۔ لاکھ آگ لگے ہزار زلزلے آئیں اور سینکڑوں فوجیں لشکر کشائی کرتی، روندتی چلی جائیں، مقامات پھر آباد ہو جاتے ہیں بالکل معدوم نہیں ہو جاتے۔ اسی طرح جب ایک جگہ آباد ہوتی ہے تو اس کی بھی تین وجوہات ہیں یا تو یہ کہ ذرائع آمد و رفت اچھے ہوں اور دوسرے یہ کہ یہاں کا موسم اور آب و ہوا قابل رہائش اور کاشتکاری ہو اور سب سے آخر یہ کہ اس کو آباد کرنے کے لئے منشاء الٰہی بھی ہو۔ جس طرح بسا اوقات

Marfat.com

اللہ تعالےٰ ایک خاص مقام کو کسی قوم کے لئے چن لیتا ہے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى	اور (پھر وہ واقعہ یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب
لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ	کیا تھا اور ہم نے حکم دیا تھا اپنی لاٹھی سے پہاڑ کی چٹان پر ضرب
بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ	لگاؤ۔ (تم دیکھو گے کہ تمہارے لئے پانی موجود ہے۔
فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ	موسےٰ نے اس حکم کی تعمیل کی
اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ	.....
قَدْ عَلِمَ كُلُّ	.....
اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ	چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور تمام لوگوں نے اپنی اپنی پانی
كُلُوْا وَاشْرَبُوْا	لینے کی جگہ معلوم کرلی۔ (اسوقت تم سے کہا گیا تھا اس آیت
مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ	گیاہ بیابان میں تمہارے لئے زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا
وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ	ہوگئی ہیں بس) کھاؤ پیو۔ خدا کی بخشائش سے فائدہ اٹھاؤ
مُفْسِدِيْنَ ۝	اور ایسا نہ کرو کہ ملک میں فتنہ و فساد پھیلاؤ۔ (یعنی ضروریات
(بقرہ)	معیشت کے لئے لڑائی جھگڑا کرو) یا ہر طرف لوٹ مار مچاتے پھرو۔

اسی طرح جب ایک مقام منشأ الٰہی سے تباہ کر دیا جاتا ہے تو وہ دوبارہ آباد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دوسرے لوگ جو بعد میں آتے ہیں ان کے لئے ایک درسِ عبرت بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ خود فرماتا ہے:۔

سَاُوْرِيْكُمْ دَارَ الْفَاسِقِيْنَ (اعراف) عنقریب ہم تم کو نافرمانوں کے گھر دکھائیں گے۔

ایک اور جگہ پر فرمایا ہے:۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا	پھر سب کو پکڑا ہم نے اپنے اپنے گناہ پر، پھر کسی پر ہم نے
عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ	ہوا سے پتھراؤ کیا اور کسی کو چیخ نے آدبایا اور کسی کو
وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا	زمین میں دھنسا دیا، اور کسی کو ہم نے غرق کر دیا۔
(عنکبوت)	

Marfat.com

تو گویا جب اللہ تعالےٰ رحمت و برکت ایک قوم پر نازل ہوتی ہے تو وہ خود اس قوم کے لئے سبب پیدا کر دیتا ہے اور پھر جب وہ نافرمانی کی حد سے باہر نکل جاتی ہے تو اللہ تعالےٰ اس کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ تاکہ وہ آنے والوں کے لئے ایک سبق بن جائے۔ ماہرین آثارِ قدیمہ نے مقامات کی تباہی و بربادی سے متعلق بہت کچھ لکھ دیا ہے مگر اس طرف کسی کی نگاہ تک نہیں گئی۔ اور درحقیقت جسقدر بھی انکشافات ہو رہے ہیں ان میں سے زیادہ تر ہمارے لئے درسِ عبرت ہیں اور بیشتر مقامات وہی ہیں جن کا ذکر قرآنِ کریم اور دیگر آسمانی صحیفوں نے کیا ہے۔

تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ ان مقامات میں بسنے والے لوگوں میں عقیدۂ توحید عام تھا اور نافرمانیوں کی وجہ سے بت پرستی شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ متعدد مقاموں کے نام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنے شہروں کو بیت اللہ کہا کرتے تھے۔ اس امر کی تصدیق حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے بیان سے بھی ہوتی ہے آپ نے اپنی تصنیف جو آخری ایام میں لکھی بعنوان "شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ" اس میں ذکر کرتے ہیں کہ

"میری تحقیق یہ ہے کہ تبت کا مرکزی شہر لاسہ دراصل لاہسہ ہے۔ یعنی بیت اللہ۔ یہ شہر آرین اقوام کی تہذیب کا پرانا مرکز ہے۔ میں نے مولانا حمید الدین فراہی مرحوم سے اس کا ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ خدا تعالےٰ کے نام کا یہ مادہ "لاہ" مذہبی دنیا کا قدیم ترین لفظ معلوم ہوتا ہے جو تمام مذاہب میں معمولی اختلاف سے مستعمل ہوتا رہا ہے"۔

کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے خود بھی ایک اسی قسم کا نظریہ قائم کیا تھا مگر جرأت نہ ہوئی کہ بغیر کسی ثبوت کے اس کو ظاہر کروں۔ مولانا مرحوم کی تحقیق پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ ثبوت کی چنداں ضرورت نہیں۔ نظریہ بذاتِ خود ایک ثبوت ہے چونکہ تحقیق ہے!

مولانا حمید الدین مرحوم کی نظرِ دقیق حقیقتاً اس تہ پر پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے جہاں ہر انسان کی دماغی کاوشیں تمام مذاہب کے آغاز اور مقتضا کی یگانگت محسوس کرتی ہیں اور اس چیز کا احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ جو اختلافات موجود ہیں تو یہ محض وقت کے مراحل طے کرنے میں پیدا ہو گئے ہیں

Marfat.com

ایسے اختلافات کے وجوہ بے انتہا ہیں۔ بہرحال اس سے ایک چیز واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند کریم
تخیل تمام مذاہب میں زمانۂ قدیم سے اس وقت تک ایک ہی رہا ہے فقط اس کے مفہوم کی ادائیگ
میں اختلافِ تخیل خلل انداز ہوا۔ یا پیروانِ مذاہب کی ذہنی تشکیل اس مذہبی تخلیل کو برداشت
نہ کر سکی اور اس میں رخنہ پڑ گیا جسقدر کہ ہر مذہب کے مفسرین نے اپنی استعداد کے مطابق
نئی نئی تصریحیں شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرح طرح کی اصطلاحات پیدا ہو گئیں جنکا سمجھنا تو
درکنار عقل کے لئے ان کا ادراک بھی مشکل ہو گیا۔ مذہب دراصل ایک ہی تھا۔ نہ تو بابلیوں
نے اپنا مذہب آشوریوں سے لیا اور نہ ہی آشوریوں نے آرین سے لیا۔ بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ
جو وقتاً فوقتاً اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو نبوت کے منصب سے سرفراز کر کے ان کو مختلف ممالک
میں بھیجتا تو وہ ان کو ان کی بھولی ہوئی تعلیم یاد دلا دیتے۔ چونکہ اس اصل تعلیم کا سرچشمہ حقیقی
حق تعالیٰ ہی تھا اس لئے ان مذاہب میں ایک قسم کی یگانگت پائی جاتی تھی جو مدتیں گذرنے
کے بعد منحرف ہو جاتی اور بار دگر انبیاء کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اس تحریف کی وجہ اکثر یہ
ہوا کرتی تھی کہ زمانے کے حوادث اور زبان کا اختلاف اس میں خلل انداز ہوتا اور کچھ قدرتی
مناظر انسانی ذہن میں اسقدر پیچیدگیاں پیدا کر دیتے کہ جو تھوڑا بہت مذہبی تخیل کا احساس
موجود ہوتا اس کا استدلال ایسے حالات کے اندر بذریعہ استخراج محض اساطیر کی شکل بن کر رہ جاتا۔ اعتبار
لحاظ سے انکی تحلیل اغراض پر مبنی ہوتی اور جب وقتی ضروریات الوہیت کا مقصد پورا کر دیتیں
تو اقوام ان کا متبع کرنے پر مجبور رہو جاتیں نہ ہی صرف یہ بلکہ اپنی ترقی کے لئے اصل مذہب سے
اس کی تطبیق بھی کر لیتیں چنانچہ جدید و قدیم تثلیث بھی اصل مذہب کی تحلیل ہے! ماحول کی کیفیت
انسانی ذہن پر اسقدر جلد اثر کرتی ہے کہ اس میں نہ صرف مذہبی تحریف و انتشار ہی پیدا ہوتا ہے
بلکہ اس میں طرح طرح کی رسومات اور بدعات بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں
میں مختلف قدرتی مناظر اسقدر پُر اثر ہوتے ہیں کہ انسانی ذہن ان کو قبول کرنے میں بہت عجلت سے
کام لیتا ہے مگر جوں جوں عقل کا ارتقا تکمیل تک پہنچتا ہے وحی بھی ترقی کرتی جاتی ہے اور روحی

Marfat.com

پے در پے مختلف ممالک میں جہاں کہیں بھی اولادِ آدم ہوئی ان کے متنبہ کرنے کے لئے نازل ہوتی رہتی ۔ اصل تعلیم ایک تھی لیکن زبان میں اختلاف ہوجانے کی وجہ سے وحی کی زبان بھی بدل جاتی۔

یہ بات کہ قدیم شہر بیت اللہ کے نام سے منسوب تھے تو ہم ان کی ذیل میں چند مثالیں قارئین کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں ۔

پنجاب کا دارالخلافہ لاہور مختلف ناموں سے پکارا جاچکا ہے ۔ اس لفظ کی موجودہ شکل زمانۂ قدیم سے یہی چلی آرہی ہے ۔ صرف کبھی کبھار اس کے تلفظ میں اختلاف واقع ہوجاتا تھا۔ لاسہ کی طرح یہ بھی میری رائے میں "لاہ" اور "اُور" کا مرکب ہے ۔ اور اس کے معنی بھی بیت اللہ ہی ہیں ۔ رہی یہ بات کہ "اُور" کا مفہوم ہم نے کس طرح "بیت" بنا لیا تو اس کے متعلق ہماری ذیل کی تحقیق پیشِ خدمت ہے ۔ لاہور واقعی ہندوستان کا ایک قدیم ترین شہر ہے اور اس کا نام مختلف وقتوں میں بدلتا رہا مگر جو اس کا اوّلین لفظ ہے "لا" وہ کبھی نہیں بدلا۔ جس طرح مولانا کی یہ تحقیق ہے کہ "لاہ سہ" (لاسہ) بیت اللہ کو کہتے ہیں اور یہ جگہ آرین مذہب کا ایک قدیم مرکز تھا ۔ اسی طرح ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ جب آرین اقوام کا ورود ہندوستان میں ہوا اور وہ وادیٔ سندھ میں بڑھتے چلے آئے ۔ تو جب لاہور پہنچے تو انھوں نے اس کا نام "لاہ اُور" رکھا۔ یہ ہمارا ذاتی فکر ہے کہ جب یہ قوم یہاں پہنچی یا جب اولین دفعہ یہ نام رکھا گیا تو اس کو آج سے تقریباً پانچ ہزار سات سو سال کا عرصہ ہوچکا ہے ۔ اب یہ سوال کہ اُور کا لفظ کہاں سے آیا، اور اس کے معنی بیت کے کس طرح ہوگئے تو یہ ہم ذیل میں اختصاراً عرض کرتے ہیں ۔

قدیم تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ آرین لوگوں کا سیلاب جب ایران پر اُمڈا تو وہ بہت عرصہ تک جاری رہا ۔ ایسا نہیں ہوا کہ ایک ماہ یا ایک سال کے اندر یہ سیلاب وسطِ ایشیاء یا قطبِ شمالی سے اُٹھ کر ایران میں آ بیٹھا ۔ بلکہ اس ہجرت کو

گئی صدیاں لگ گئیں۔ اور آرین اقوام کے کئی گروہ مختلف وقتوں میں مختلف راستوں سے آتے رہے چنانچہ ان کا ایک گروہ اناطولیہ میں داخل ہوا جس کو تاریخِ حتّی (HITTITES۔) کے نام سے پکارتی ہے۔ ان کے ساتھ ایک اور گروہ بھی تھا جو اناطولیہ میں تو داخل نہیں ہوا مگر اناطولیہ کے جنوب مشرق میں قابض ہو گیا۔ یہ علاقہ جو انھوں نے فتح کیا تو اس کا حدود اربعہ تقریباً وہی تھا جو اس علاقے کا تھا جسکو یونانیوں نے میسڈیا (ماوا) کے نام سے موسوم کیا۔ اس گروہ کا نام تاریخ میں میتانی لیا جاتا ہے (MITANI۔) اور یہ وہ میتانی ہیں جو آگے چل کر تاریخ میں ہوری (HURRI۔) کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

ہماری تحقیق کے مطابق یہ نہ تو ہوری تھے اور نہ ہی ہوری۔ ان کا اصل نام اُور تھا اور اس لفظ کا مطلب ہماری دانست میں "آباد ہونیوالا" یعنی (SETTLER۔) ہے۔ یہ وہی اُور تھے جنھوں نے آگے چل کر اُر کا شہر آباد کیا جو شط العرب پر واقع ہے اور جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ یہ زمانہ تھا کہ اسی گروہ کا کچھ حصّہ وادی سندھ میں بھی پہنچا اور یہاں آکر انھوں نے اپنی پیشتر ہی سے ساختہ تہذیب کا پرچار شروع کر دیا اور ہڑپا (HARAPPA۔) اور موہنجو دارو (MOHANJO DARO) کی آبادیوں کی بنیادیں کھڑی کر دیں۔ ہڑپا۔ منٹگمری (پنجاب) کے نزدیک برلب راوی واقع تھا اور موہنجو دارو کراچی کے قریب تھا۔ کیا یہ امر قابلِ یقین نہیں کہ منٹگمری کے نزدیک تو یہ گروہ پہنچ گیا ہو، مگر لاہور جس کی فضا اس سے بدرجہا اچھی ہے اور اس وقت بھی یقیناً ہوگی، وہاں تک اس کی رسائی نہ ہوئی ہو؟ یقیناً وہ گیا اور وہاں پہنچکر اس نے لاہور کی بنیاد رکھی، اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اگر واقعی میں ایسا ہے جو کچھ بعید نہیں تو لاہور دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک شہر ہے جو متواتر آباد رہا، باوجودیکہ کئی مرتبہ تباہ و برباد ہوا۔ لاہور کو ہمارے نزدیک اس بات کا فخر حاصل ہے کہ وہ کرکوک اور اربیل کی طرح دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ایک ہے۔ یہ ہمارا ذاتی فکر ہے کہ لاہور کا نام اول روز سے یہی ہے جو زبان کے اختلاف کی وجہ سے بدلتا رہا۔ اور آرین اقوام کا قدیم ترین مذہبی مرکز ہندوستان میں یہی ہے۔ چنانچہ اب ذرا لفظ لاہور پر غور فرمائیے جس طرح لاسہ دراصل لاہ اور سہ ہے اسی طرح لاہور بھی 'لاہ"

اور "اُور" ہے اور دونوں کا مطلب بیت اللہ ہے اگر تحت اللفظ لاہور کا ترجمہ کیا جائے مندرجہ بالا بیان کے مطابق تو معنی نکلتے ہیں۔ "اللہ کا آباد کیا ہوا" تو پھر اللہ ہی کا گھر ہوا! یہی وہ اُور یا ہُور (HOR) ہیں جو آج کل بھی صوبہ سندھ میں موجود ہیں۔ ان کا ذکر سکندر مقدونی کا مورخ پلوٹ آرک (PLUTARCH) بھی کرتا ہے اور ان کے متعلق کہتا ہے کہ یہ ہندوستان میں سب سے زیادہ بہادر اور جنگجو قوم ہے۔ یہ بحث نہایت دلچسپ اور طویل ہے مگر طوالتِ تحریر اس وقت مدِ نظر نہیں۔ ہمیں اس وقت چند اور مقاموں کا ذکر کرنا ہے جن کا تعلق ہماری اسی بحث بیت اللہ سے متعلق ہے۔ حال ہی میں ہمیں ایک اور تحقیق کا پتہ چلا ہے جو یہ بتلاتی ہے کہ اُور کا اصل یا یوں کہیئے سب سے قدیم نام (یہ اُور وہی اُر UR ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی) اُوروکو (URU-KU) تھا۔ اس کے متعلق ویڈل (L.D.WADDELL) اپنی مشہور و معروف کتاب

THE MAKERS OF CIVILIZATION IN RACE AND HISTORY

میں (ص ۴۴۵) فرماتے ہیں کہ اس نام کا مطلب (HOLY CITY.) ہے یعنی بیت المقدس! لفظ اُروکو کو وہ دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک "اُور و" اور دوسرا "کو" پہلے حصے کے معنی شہر، بستی، یا بیت کے ہیں اور دوسرے حصے کے معنی مقدس لکھتے ہیں گویا جو معنی ہم نے کئے ہیں ان کے بہت لگ بھگ ہوئے۔ حقیقت یہی ہے کہ اُر تھے بسانیوالے اور ان کو بستی سے منسوب کر دیا گیا۔

اب ذرا شہر بابل کے لفظ پر غور فرمایئے۔ یہ مقام اُر سے کچھ دور نہیں۔ اسی ہلالِ خصیب میں واقع ہے اور تقریباً ۲۵۰ میل کا فاصلہ ان دونوں کے درمیان ہے۔ یہ مقام بھی قدیم تہذیب کا مرکز بہت مدت تک رہ چکا ہے۔ کئی بار تباہ ہوا اور کئی بار آباد ہوا۔ اور بالآخر معدوم ہو گیا۔ انگریزی زبان میں اس کے لئے (BABYLON) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ لغت کے لحاظ سے غلط ہے۔ خطِ میخی کے کتبوں سے جو نام اس شہر کا حل ہوا ہے وہ

یہ ہے (BAB-ILI) جس سے ہمارے عرب مورخین نے بابل اور بابلی بنایا۔ اس کے معنی مستشرقین نے (THE GATE OF GOD.) یعنی باب اللہ کے ہیں یا دوسرے لفظوں میں بیت اللہ کہہ لیجئے۔ یہاں لفظ "لا" موجود ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے صرف دو باتیں واضح کرنا مقصود تھا۔ اوّل یہ کہ آج کل قدیم تاریخ کے ماہرین جو کچھ ہمیں دکھا رہے ہیں وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ ہمارے لئے درسِ عبرت ہوں۔ اور دوسرے اللہ تعالےٰ اکثر مقامات کا تعین خود کر لیتا ہے۔ اور بسا اوقات عبادت کا مرکز بنا کر اس مقام کو بڑھا دیتا ہے۔ اور جب وہاں کے لوگ اللہ تعالےٰ کی عبادت سے غافل ہو جاتے ہیں تو وہاں نبی بھی آتے ہیں۔ جو قوم کی زبان میں تبلیغ کرتے ہیں، اور اگر نبیوں کی آمد کے باوجود لوگ عبادت میں تحریف پیدا کر دیں تو اللہ تعالےٰ ان مقامات کو اور ان میں بسنے والی قوموں کو نیست و نابود کر دیتے ہیں تاکہ آئندہ آنے والے دیکھیں اور نصیحت پکڑیں۔ ان تمام اقوام کی گمراہی یہی ہوا کرتی تھی کہ وہ

"حقیقت[1] کو چھوڑ کر مظاہر کی پرستش کرنے لگتے تھے کیونکہ وہ ان کے سامنے شاہد اور محسوس ہیں، حالانکہ مظاہر صرف "حقیقت" کے وجود اور اس کی ہستی کے لئے دلیل ہیں نہ کہ بجائے خود "حقیقت" اسی لئے تغیر و تبدل، وجود و فنا، طلوع و غروب ناپائیداری اور بے ثباتی، مظاہر کے رگ و ریشے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور حقیقت (ذات واحد) ان تمام تغیرات سے پاک اور بالاتر ہے"

ان لوگوں کا حشر بھی ہم کو بخوبی معلوم ہے یہ صفحہ ہستی سے یک قلم مٹا دیئے گئے۔ چنانچہ یہ جو مقامات ہم آجکل دیکھ رہے ہیں یہ وہی مقامات ہیں جو اللہ تعالےٰ کے قہر کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئے۔ ان کے متعلق بہت کچھ پیش کیا جا چکا ہے اور بہت کچھ پیش کرنا ابھی باقی ہے۔

ہم نے اس باب کے شروع میں وادی سنا کا بھی سرسری طور پر ذکر کیا تھا چونکہ اس بات کے عنوان میں یہ

---

[1] قصص القرآن ج ۲ ص ۲۵۷ ۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی۔

Marfat.com

موضوع بھی شامل ہے اس لئے اب کچھ تھوڑا بہت اسی سے متعلق عرض کرتے ہیں ہم نے عرض کیا تھا کہ مشرق وسطیٰ کے قدیم مقامات سے اس کو بہت کچھ مناسبت ہے یہ موضوع دراصل اثریات (ASSYRIOLOGY) کی حدود میں پڑتا ہے ۔ اس موضوع کے لئے ہم نے اس کتاب کا آخری باب مخصوص کر دیا ہے لیکن یہاں جستہ جستہ اس مناسبت کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

ماہرین اثریات اس بات پر مورخین اور مستشرقین کے ساتھ متفق ہیں کہ سامی[1] اور غیر سامی[2] اقوام کی تقسیم درست ہے، ہماری نگاہ میں یہ تقسیم ایک نظریہ ہے اور عارضی ہے اور قابلِ تنقید ہے۔ کسی خدائی صحیفہ میں نہیں لکھا کہ ایسا ضرور ہوگا۔

جس وقت میکس مولر (MAX MULLER) نے اپنی رائے اس سے متعلق ظاہر کی تو اس کی نگاہ میں اس وقت زبانوں کی تقسیم تھی نہ کہ اقوام کی۔ اُس نے اپنے لئے سہولت پیدا کرنا چاہی اور چونکہ اس نام سے ایک قوم موجود تھی لہٰذا آرین کا عقیدہ پیدا ہوگا۔ درحقیقت آرین سے اس کا مطلب کسی خاص قوم سے نہ تھا، بلکہ چند ایک زبانیں جو آپس میں ملتی جلتی ہیں ان کا اصل منبع معلوم کرنا چاہا۔ چنانچہ یہ جو آرین قوم موجود تھی۔ اس نے یہ غلط فہمی پیدا کر دی اور مورخین نے تصور کر لیا کہ سامی لوگ اکثر نسلاً عرب ہیں اور غیر سامی آرین ہیں۔

چنانچہ یہ تقسیم ماہرین اثریات (ASSYRIOLOGISTS) نے بھی اپنا لی۔ اور جب ہلال خصیب میں سامری، غیر سامی اور آکادی[3] اقوام کی تشخیص ہوئی تو فیصلہ یہ ٹھہرا کہ سامری غیر سامی لوگ ہیں یعنی آرین اور آکادی سامی ہیں۔ یہ مسئلہ بڑھتے بڑھتے اسقدر پیچیدہ ہو گیا کہ ماہرین اثریات کے لئے خود وبالِ جان بن گیا اور آج تک اس مسئلہ کا صحیح حل کوئی پیش نہیں کر سکا۔

---

[1] سامی یعنی SEMETIC [2] غیر سامی یعنی NON SEMETIC سامری SUMMERIANS یا آرین ARYIANS سامری ہلال خصیب کے جنوب میں آباد تھے

[3] آکادی AKKADIANS سامی النسل تھے۔ اور ہلالِ خصیب کے شمال میں آباد تھے اس مملکت کا دار الخلافہ اول آکاد تھا (AKKAD) بعض مستشرق نے اس کو (AGADE) یعنی آغاد بھی کہا ہے اور بعض اس کو ایودھیا (AYODHIA ۔) جس کا ذکر مہابھارت میں آتا ہے۔ کہتے ہیں!۔

Marfat.com

اقوام کے مدوجزر نے اسقدر اختلاط پیدا کر دیا تھا کہ یہ کہنا کہ فلاں قوم فلاں علاقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ بالکل ناممکن ہے۔ چنانچہ ارض القرآن میں اسی جدید تحقیق کے مطابق، مولانا سید سلیمان ندوی بھی اسی غلطی کا شکار رہ گئے ہیں۔ نامناسب نہ ہوگا کہ جدید تحقیق کے مطابق اس کی تصحیح کر دی جائے موصوف ارض القرآن ج اول ص ۱۳۷ پر فرماتے ہیں:۔

"اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر سامی آبادی سامیوں سے پہلے یہاں آباد تھی۔ ان کی زبان سومیری اور آکادی ہے۔ جس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ غیر سامی آبادی، آکادی اور سومیری تھی"

موجودہ تحقیق کے مطابق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ غیر سامی لوگ سومیری تھے (SUMMERIANS) یا دوسرے الفاظ میں آرین اور جو آکادی لوگ تھے وہ سامی تھے، نہ کہ جس طرح مولانا نے ارشاد فرمایا ہے اور غیر سامی اقوام واقعی ہی سب سے پہلے ہلالِ خصیب میں آباد تھیں۔ اور خاص کر مملکتِ بابل میں تو آکادی یعنی سامیوں کے آثار بہت بعد میں ملتے ہیں۔ ہم اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ یہ جو جدید نظریہ ہم نے بیان کیا ہے یہ سب سے آخری ہے۔ اہم انکشافات ہو رہے ہیں بہت ممکن ہے کہ وہ اس نظریہ کو بھی ناقابلِ قبول قرار دے دیں۔ تاہم اس وقت یہی نظریہ مستند اور جدید ہے۔

ایک اور اہم غلطی جو عوام کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ تاریخِ قدیم اور علومِ آثارِ قدیمہ و آثریات کے جب وہ مطالعہ کرتے ہیں تو وہ کسی مستند کتاب سے اطلاعات بہم نہیں پہنچاتے۔ بلکہ ہر وہ کتاب جو تاریخ کے متعلق ہو اس کا مطالعہ کر کے حوالہ دینا شروع کر دیتے ہیں۔

لہ آکادی (AKK-ADANS) سامی النسل تھے۔ اور ہلال خصیب کے شمال میں آباد تھے اس مملکت کا دارالخلافہ اوّل آکاد تھا (AKKAD) بعض مستشرق نے اس کو (AGADE) یعنی آغاد بھی کہا ہے اور بعض اس کو ایودھیا (AYODHIA) جس کا ذکر رامائن میں آتا ہے، کہتے ہیں!

Marfat.com

یہ ایک قطعی امر ہے کہ سند صرف اسی شخص سے حاصل کی جاسکتی ہے جو ماہرِ فن مانا جاتا ہو اور جس نے خود اپنے ہاتھ سے یہ کام کیا ہو۔ محدّث کبھی تفسیر کے لئے سند قرار نہیں دیا جائے گا۔ اسی طرح فقیہ مورخ نہیں کہلا سکتا اگرچہ وہ ان سے واقف کیوں نہ ہو۔ جرّاح جراحی کا ماہر تصور کیا جائے گا اور اسے کوئی حق نہیں کہ وہ طب میں دخل دے! یہ بات ہر علم کے لئے ثابت و مسلم ہے دوسری غلطی یہ ہے کہ اس موضوع پر کتابیں کم ہیں اور جو ہیں وہ اکثر ناپید ہیں اور پھر وہ بھی جدید نہیں۔ یہ مشکل جنگ عظیم اوّل کے بعد پیدا ہوئی جب عمل تنقیب کو محدود اور حفیہ کر دیا گیا پھر جو اقوام بائیں طرف سے لکھنا شروع کرتی تھیں ان کو غیر سامی یا سمیری یا آرین کہہ دیا گیا اور جنکا رسم الخط دائیں طرف سے شروع ہوتا تھا ان کو سامی بتایا گیا۔ بہت حد تک تو یہ قیاس درست تھا۔ مگر زبان کے اختلاف کی وجہ سے اگر اقوام کو مختلف بتایا جائے تو کہاں کی عقلمندی ہے! اس سے کہیں خدانخواستہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم قومیت کے خلاف ہیں۔ ہماری دانست میں مسئلہ اقوام اور مسئلہ قومیت دو مختلف پہلو ہیں ایک ہی حقیقت کے اور چونکہ قومیت کا سوال اس وقت ہمارے موضوع سے الگ ہے، ہم اسپر اظہارِ خیال کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔

بہرحال حضرت آدم علیہ السلام سب ہی کے جدِّ امجد ہیں تو پھر اختلافِ اقوام کے کیا معنی؟ اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کا تصور بھی تو ہر قوم میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے! ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ آرین ایک زمانہ میں عروج پر تھے اور انھوں نے اُس وقت کی تہذیب میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اس مسئلہ پر جن احباب کو مزید اطلاعات کی ضرورت ہو اور مطالعہ کا شگفتہ مذاق بھی رکھتے ہوں تو ایسے اصحاب کو ہم حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف ترجمان القرآن جلد دوم میں سورۂ کہف کی تفسیر کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ یہ تفسیر نہایت غور و خوض کی مقتضی ہے۔ ہم نے اس موضوع کا بہت تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے

Marfat.com

کہ اس وقت اُردو زبان میں فقط یہی ایک تفسیر موجود ہے جس میں تاریخ قدیم سے متعلق جدید معلومات نہایت خوش اسلوبی سے اور نہایت مختصر طور پر قلمبند کر دی گئی ہیں۔

اور بھی متعدد مقامات پر مولانا نے اس موضوع پر ترجمان القرآن ہی میں مباحث درج کیے ہیں جو کہ نہایت درجہ داد و تحسین کے حقدار ہیں۔

اب ہم اپنے اصلی موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یعنی ہلال خصیب اور وادی سندھ کی تہذیبوں میں کیا مناسبت ہے۔

سردار دھاکرشنا ایک مقالے میں جو LEGACY OF INDIA میں شائع ہو چکا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"کالیکم نیا KALIKUM NAYA یا کبجی کملا تانترا KUBJI-KAMLA TANTRA میں ایک روایت ہے جس کے معانی یہ ہیں کہ ہندوستان میں چلے جاؤ اور تمام ملک پر اپنا تسلط جما لو۔ میں تمہارے تک نہیں پہنچوں گا جب تک تم وہاں حکمران نہ ہو جاؤ گے"

پیشتر اس کے کہ ہم اس کی تفصیل میں جائیں ایک اور حوالہ دے دینا بہتر سمجھتے ہیں تاکہ جس وقت ہم ان دونوں مقاموں کی مناسبت قائم کریں تو ہر دو اسناد قارئین کرام کے سامنے موجود ہوں جس پر ہماری اس بحث کا دارومدار ہوگا۔ مسٹر مانک پٹھاوالا MANEK B. PATHAWALA ہندوستان کے ایک مشہور ماہر آثار قدیمہ ہیں اور وادی سندھ میں بھی مشغول کار رہے ہیں اپنی کتاب A GEOGRAPHIKAL ANALYSIS OF THE LOWER INDUS BASIN میں رقمطراز ہیں:۔

Marfat.com

"سومری اور سامی لوگ جو سمندر پار سے آئے ان سے انھوں نے اپنی تہذیب حاصل کی"
اب ہم ان دونوں سوالوں کی مناسب تفصیل کرتے ہیں۔ سر رادھا کرشنا والے اقتباس میں کہا گیا تھا "ہندوستان چلے جاؤ" مگر اس میں یہ ذکر نہیں کہ کون؟ یہ اقتباس موصوف کے مقالہ کے اس حصے سے ہے، جہاں آپ آرین کا ذکر کرتے ہیں اور انہیں ایران تک پہنچاتے ہیں اور جب بعد میں وہ ایران سے ہندوستان کی طرف ہجرت کرتے ہیں تو اس کو موصوف ایک مذہبی رنگ میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ ہجرت بھی وحی کے حکم کے مطابق ہو! دوسرے حوالے میں ذکر ہے "انھوں نے تمام تہذیب حاصل کی" تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کن لوگوں نے؟ پیٹھا والا صاحب ذکر وادی سندھ کے لوگوں کا کر رہے ہیں۔ اس لئے اس میں چنداں اشتباہ کا امکان نہیں۔ اب سطور بالا سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ سندھ میں جو جدید معلومات حاصل ہو رہی ہیں ان کا تعلق یقیناً ہلالِ خصیب کی تہذیب سے ہے اور یہ تہذیب جو وادی سندھ میں مل چکی ہے وہاں ہی سے آئی ہوئی ہے۔ ہمارے ہندوستانی مورخین اور ماہر آثار قدیمہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم بھی انھیں منوانا نہیں چاہتے مگر کچھ امور جو غور طلب ہیں ضرور ان کی طرف ایسے احباب کی توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب دڑاوڑ (DRAVIDIAN) تہذیب تھی اور جس وقت آرین آئے تو انھوں نے اس تہذیب کو موجود پایا۔ ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ جو تہذیب ہمیں اس وقت ہڑپا اور موہنجودارو میں ملی ہے یہ آرین تہذیب نہیں؟ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے کہ وہ آرین تہذیب ہی تھی ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ جب اوّل اوّل آرین کا ورود ہندوستان میں شروع ہوا تو اس وقت سندھ میں اور ممکن ہے ہندوستان کے دیگر مقامات میں واقعی ایک دڑاوڑ تہذیب موجود تھی۔ بات صرف یہ ہوئی کہ آرین آئے تو اسی طرح حملہ آور ہوئے جس طرح پہلے ہوتے چلے آئے تھے۔ آبادیاں گراتے اور انکی جگہ دوسری آباد کرتے ہوئے ہندوستان میں اس وقت سب

سے زرخیز علاقہ جو نو واردوں کے قریب تھا وہ یہی وادی سندھ اور پنجاب تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنا قیام اوّل اوّل انہی دوجگہوں تک محدود رکھا ہوگا۔ وادی گنگا میں وہ بہت بعد میں بڑھے ہوں گے۔ ان سے کئی صدیاں پیشتر دراوڑ قوم ان مقامات پر پہنچ چکی تھی حقیقت میں یہ دونوں ایک ہی نسل سے تھے جنہیں علیحدہ ہوئے غالباً کئی ہزار سال گذر چکے تھے۔ لیکن اب ان کے خط و خال اور رنگ و روپ میں اختلاف واقع ہو چکا تھا جو محض موسم کی وجہ سے تھا۔

یہ بھی ایک واقعی امر ہے کہ آب و ہوا نہ صرف نسلوں کے روپ ہی بدل دیتی ہے اور ان کے خط و خال میں تفاوت پیدا کر دیتی ہے بلکہ ان کی بود و باش نشست و برخاست انکی عادات گویا کہ تمام تہذیب و تمدن کو بھی کلیتہً بدل دیتی ہے۔ یہ موسم کا خاصہ ہے اور اس کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اگرچہ یہ بات ہمارے موضوع سے ہٹی ہوئی ہے، تاہم اس کی دلچسپی کو مدّنظر رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصاراً تھوڑا بہت عرض کر دیا جائے۔

انسانی معاشرت آب و ہوا کے ساتھ وابستہ ہے یہ مشاہدہ اور تجربہ یہی بتاتا ہے کہ آب و ہوا کا اوّل اثر و تعلق مقامات کی مٹی میں ہوتا ہے اور بعد میں ان کے خط و خال اور رنگ و روپ پر! آب و ہوا اپنی خاصیت کے مطابق مٹی کے رنگ کو بدلتی رہتی ہے۔ اور اسی نسبت سے اس کا اثر انسانی رنگ و روپ کو بھی بدلتا رہتا ہے۔ اگر آب و ہوا میں اعتدال اور رطوبت ہے تو مٹی کا رنگ گندمی ہوگا اور اگر رطوبت زیادہ ہے تو مٹی کا رنگ سیاہ ہوگا۔ بوجہ سردی یا گرمی کی شدت سے مٹی کا رنگ ہلکا ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب ایک مقام میں موسم اگر انتہائی ہو تو وہاں کی مٹی کی رنگت سفیدی مائل یا پیلاہٹ پر ہو گی اور وہاں کے باشندوں کے رنگ بھی سفید ہوں گے بہ نسبت ان علاقوں کے جہاں رطوبت زیادہ ہوتی ہے یا اعتدال پر موسم ہوتا ہے۔ اس مشاہدہ کیلئے ہم دور نہیں جاتے۔ خود ہندوستان کے مختلف حصوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

آپ صوبہ مدراس سے سفر شروع کیجئے۔ اور سنٹرل انڈین اسٹیٹس سے ہوتے ہوئے

Marfat.com

(CENTRAL INDIAN STATES.) پنجاب کی طرف آیئے اور یہاں سے ملتان ہوتے ہوئے کوئٹہ اور بلوچستان کی سیاحت کیجئے۔ آپ کو موسموں میں اختلاف کا پتہ چل جائے گا اور جوں جوں موسم بدلتا جائے گا اس جگہ کی مٹی کا رنگ بھی بدلتا جائے گا، یہانتک کہ جنوب اور وسطِ ہند کی مٹی جو کہ سیاہ رنگ رکھتی ہے۔ پنجاب پہنچ کر گندمی رنگ اختیار کرلے گی اور کوئٹہ پہنچتے ہی اس کا رنگ پیلاہٹ پر آجاتا ہے اور اس کے مطابق ہی باشندوں کی رنگت کبھی بدلتی جاتی ہے۔

ہمارا یہ نظریہ اپنے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے، اور سفر کے وقت ہم نے ان امور کا خاص لحاظ رکھا تھا کہ کہیں غلطی نہ لگ جائے۔ بندیل کھنڈ میں دو ایک مقام پر شک ہوا مگر یہ سطحی معائنہ تھا جب تین چار انچ زمین کھودی تو رنگت علاقے کے موسم کے مطابق نکلی! ممکن ہے ماہرین کے پاس اس کے اور وجوہات بھی ہوں مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ بھی ایک اہم وجہ ہے۔ زمین میں بعض معدنیات کی وجہ سے بھی رنگ مٹی کا بدل جاتا ہے مثلاً آتش فشاں علاقوں میں گندھک زیادہ ہونے کی وجہ سے بھی مٹی کا رنگ پیلاہٹ پر ہو جاتا ہے۔ ہم بات کی تصدیق ہم نے ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی کی جو قارئینِ کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

وسط اور جنوبی ایران، عراق، شام، اور فلسطین (علاوہ ساحلی علاقوں کے) اور مصر وغیرہ، ان تمام علاقوں میں رطوبت آب و ہوا میں موجود نہیں۔ اور موسم گرما اور سرما دونوں شدت سے ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہم ہندوستانی ان کا تخیل بھی نہیں کر سکتے ان تمام مقامات پر مٹی کا رنگ پیلاہٹ پر ہے اور باشندوں کے رنگ سرخ و سفید اور کھلے کھلے۔ ایران کا شمالی حصہ جو بحرۂ خضر کے جنوب میں ہے وہاں موسم میں رطوبت ہوتی ہے۔ آپ گیلان، مازندران اور آذربائیجان کی سیاحت کیجئے۔ گرمیوں کے موسم میں آپ ضرور دو مہینے ہوا میں رطوبت محسوس کریں گے۔ ان علاقوں کی مٹی کی رنگت گندمی رنگ کی ہے اور باشندوں کے رنگ اکثر گندمی ہیں۔ آپ بندر پہلوی سے اگر روانہ ہو کر رشت اور قزوین کی راہ سے تہران آئیں

Marfat.com

توآپ کو یہ تبدیلی موسم میں بہت جلد نمایاں ہو جائے گی اور آب و ہوا کی شدت کے ساتھ رنگ سرخ و سفید نظر آنے شروع ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ اگر آپ ہمدان سے ہوتے ہوئے قصر شیریں اور بغداد تک جب پہنچیں گے تو یہ بات اور بھی زیادہ نمایاں ہو جائے گی۔ مٹی کا یہ حال ہے کہ تمام عمارات اس طرح معلوم ہوتی ہیں جیسے ان پر ملتانی مٹی کا لیپ کیا گیا ہے بالکل ویسے ہی جس طرح بچوں کی تختیوں پر ملتانی مٹی ملی جاتی ہے!

یورپ کا موسم ان علاقوں سے مختلف ہے اور پھر یورپ میں بحیرۂ روم کے خطے کچھ اور بھی اختلاف موسم رکھتے ہیں۔ یورپ میں گرمی شدت سے نہیں ہوتی اور رطوبت بھی مفقود ہے موسم سرما شدت کا ہوتا ہے اس لئے اس جگہ کی مٹی کا رنگ بجائے سیاہی یا سفیدی مائل ہونے کے کچھ سرخی پر ہوتا ہے چونکہ اکثر مکانات کی تعمیر پتھروں سے ہوتی ہے اس لئے مٹی کا رنگ اچھی طرح واضح نہیں ہو سکتا۔ تاہم جو چیزیں مٹی سے بنی ہیں ان سے مٹی کی رنگت کا اندازہ لگ سکتا ہے بحیرۂ روم کے علاقوں میں پھر رطوبت بڑھ جاتی ہے اور اسی طرح اس میں مناسب تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ - - - - - - - - - - اور باشندوں کے رنگ بھی گندمی نظر آتے ہیں۔ مثلاً اٹلی، یونان، ترکی وغیرہم۔ یونان اور دیگر ممالک کے متعلق یہ بات ہیروڈوٹس[1] (HERODOTUS -) سے بھی چھپی نہیں رہی اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے بھی اپنی سیاحت کی داستانوں میں اس امر کی طرف توجہ دلوائی والقصۃ بطولہا۔

---

[1] ہیروڈوٹس (- HERODOTUS) یہ ایک یونانی مورخ تھا جس نے اول اول قدیم تاریخ اور آثار قدیمہ جو ہلال خصیب میں واقع تھے انکی طرف توجہ دلوائی۔ گذشتہ صدی تک مستشرقین یہی سمجھتے آئے کہ اس مورخ کے بیانات محض تک بندی ہیں اور مستند نہیں ہیں۔ مگر جوں جوں علم تنقیب ترقی کرتا گیا ہیروڈوٹس کے بیانات کی تصدیق ہوتی چلی گئی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا (ENCYCLOPAEDIA BRITANICA) اس کا زمانہ ۴۸۴ سے لے کر ۴۲۵ قبل مسیح تک بتاتا ہے۔

Marfat.com

ہمارا مقصد یہ بتانا تھا کہ آب وہوا کس طرح انسانوں کی زندگی میں ان کے ہر پہلو پر اثر کرتی ہے اور ڈراوڑ جو کہ دراصل آرین ہی کی نسل سے تھے مگر ان سے بہت پہلے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے اور مختلف موسموں میں رہتے ہوئے جب یہ ہندوستان میں پہنچے تو یہ جنوب کی طرف سے شمال کو بڑھے تھے اس علیحدگی کا عرصہ کئی ہزار سال کا ہوگا اسی لئے ان میں بے انداز فرق پڑ چکا تھا۔ اس آب وہوا نے ان کی تہذیب اور شکل و شباہت کو بدل کر رکھ دیا۔ جب آرین ہندوستان پہنچے تو انھوں نے ان کو ضرور حقارت کی نگاہ سے دیکھا ہوگا۔ اور بار دیگر انھیں جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ اور ان کی تہذیب کو تباہ و برباد کر کے اس کی جگہ از سر نو ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی ہوگی۔

یہ بھی ایک حقیقی امر ہے کہ جب ایک فاتح قوم مفتوح پر اپنے تمدن و تہذیب کا اثر ڈالتی ہے وہ یہ بات ایک غیر شعوری طور پر ثابت کر دیتی ہے کہ ہمارا ہی تمدن اور ہماری ہی تہذیب سب سے بہتر ہے لہٰذا اس کو رائج ہونا چاہیئے۔ اس میں بھی بہت سی حقیقتیں پنہاں ہیں۔ فاتح قوم جب تک مفتوح قوم سے زیادہ ترقی یافتہ نہ ہوگی اس کا فاتح بننا ہی ناممکن ہے۔ اور جب پھر اسی ترقی یافتہ قوم کی تہذیب اور اس کا تمدن گرنے شروع ہوتے ہیں تو وہ قوم ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی جگہ کچھ دوسری قوم صالح پیدا ہوتی ہے اور حکمرانی کرتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیت اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	اللہ نے وعدہ کر لیا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي	میں سے ایمان والے ہیں اور جنہوں نے نیک کام کئے اور
الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ	بعد میں ان کو ضرور حکمران کروں گا۔ ملکوں پر جس طرح ان
قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي	سے پہلوں کو حکمران کیا تھا اور ان کے لئے پکا کر دیگا ان
ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ	کا دین اور دیگا ان کو جو وہ پسند کریں گے اور
خَوْفِهِمْ اَمْنًا	ملے گا ان کو امن خوف کے بدلے۔

مندرجہ بالا آیت میں شرطِ حکومت مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے یکساں ہے جیسے قرآنِ کریم کا

Marfat.com

ارشاد ہے:-

وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ

چنانچہ جب آرین کا ورود ہندوستان میں ہوا تو دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ ڈراوڑ کیسے سیاہ رنگ کے لوگ ہیں۔ اور غالباً جب ان کے تین ہزار برس بعد مسلمان لشکروں نے حملہ کیا تو انھوں نے بھی یہی کہا ہوگا۔ انگریزوں کا تو یقیناً یہی رویہ ہے! اور اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس کی ہلکی سی نفسیاتی تحلیل کی جائے تو ممکن ہے اس میں بہت کچھ احساسِ کمتری کا عنصر ملا ہوا پایا جائے مگر کون مانتا ہے ایسی تحلیل کو! حیرت کا مقام ہے کہ عیسائی مورخین بھی تقسیم اقوام میں یقین رکھتے ہیں جن کا یہ ایمان ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے دنیا شروع ہوئی۔ ہماری نگاہ میں یہ اختلاف محض رنگ و زبان کا ہی پیدا کردہ ہے ورنہ مسئلۂ اقوام کوئی شے نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے قبیلے اور خاندان محض شناخت کے لئے بنائے نہ کہ ان میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

دل تو چاہتا ہے کہ کچھ اور تفصیل میں جا کر مستشرقین کی آنکھیں کھول دی جائیں، مگر طبیعت مانع ہے۔ یہاں پر اتنی ہی تفصیل کافی معلوم ہوتی ہے۔

یہ جو ابھی بالا میں ذکر کیا ہے کہ آرین اقوام کو ہجرت کا حکم ہوا کہ وہ ہندوستان میں آئیں اور حکومت کریں تو اس ضمن میں ہم نے عرض کیا تھا کہ ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ وحی کے ماتحت ہو جو ان کے کسی نبی کو ہوئی ہو۔ اس طرح ہوتا آیا ہے۔ جیسے اسرائیلیوں کے انبیاء کو ہوتا رہا مگر وہ تعمیل کے بعد نافرمانی کرتے اور پھر اس صفحۂ ہستی سے یک قلم مٹا دیئے جاتے۔ قرآنِ کریم ہمیں یاد دلاتا ہے:-

وَاِذْ قِیْلَ لَھُمُ اسْکُنُوْا	اور پھر (وہ واقعہ یاد کرو) جب بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ اس
ھٰذِہِ الْقَرْیَۃَ وَکُلُوْا مِنْھَا	شہر میں جا کر آباد ہو جاؤ (جس کے فتح کرنے کی تمہیں توفیق ملی ہو)
حَیْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّۃٌ	اور (نہایت زرخیز علاقہ ہے) جس جگہ سے چاہو، اپنی غذا حاصل
وَّادْخُلُوا الْبَابَ	کرو اور تمہاری زبانوں پر حِطَّۃٌ کا کلمہ جاری ہو، اور اس کے

Marfat.com

سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓئٰتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (اعراف) — دروازے میں داخل ہو تو (اللہ کے حضور) جھکے ہوئے ہو، ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور نیک کرداروں کو (اس سے بھی) زیادہ اجر دیں گے۔

بہت ممکن ہے اس قسم کا کوئی اور حکم ہو، اور ان کو ہدایت کی گئی ہو کہ فلاں ملک میں لوگ نافرمانی پر تلے ہوئے ہیں تم جاکر توحید کا اعلان کرو اور اللہ کی حکومت کو مستحکم بناؤ۔ اگرچہ تم کتنی ہی قلیل تعداد میں کیوں نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ایسا ہی ہوتا ہے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ) — اور کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر حکم الٰہی سے غالب آگئیں

آرین نے دڑاوڑوں کو نکال جنوب کی طرف دوبارہ پھینک دیا اور ایک عالمگیر تہذیب کی بنیاد رکھی۔ پیشتر کہ ہم یہ بتائیں کہ آرین نے موجودہ تہذیب کے اندر کیا کچھ اضافہ کیا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ سہولت کے لئے اس طرف بھی اشارہ کر دیا جائے کہ آرین کس طرف سے ہندوستان آئے اور کب؟

مورخین یہ کہتے آئے ہیں اور اب بھی یہی کہتے چلے جاتے ہیں کہ آرین اقوام ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح کے قریب ہندوستان میں شمال کی طرف سے وارد ہونا شروع ہوئیں اور تقریباً پانصد سال قبل مسیح تک آتی رہیں۔ ہمارا بنیادی اختلاف مورخین اور مستشرقین کے ساتھ یہاں ہی ہے۔ ہماری دانست میں آرین اقوام ہندوستان میں پہلے پہل سندھ میں آئیں کچھ خشکی کے راستے ساحل کے ساتھ ساتھ اور کچھ سمندر پار کر کے پہنچیں۔ اور ان کے آنے کا وقت تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح ہے اور ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح تک ان کا ورود جاری رہا اسکے بعد اگر انکی ہجرت جاری رہی تو وہ بہت قلیل تعداد میں تھی۔ بعینہٖ جس طرح آج کل بھی گاہے گاہے ایرانیوں کی نقل و حرکت ہوتی رہتی ہے اور وہ پونہ اور بمبئی آکر بس جاتے ہیں۔ تہذیب کے مرکز بدل چکے ہیں اگر وہی قدیم مرکز چلے آتے تو شاید یہ موہنجو ڈارو اور ہڑپا ہی میں قیام پذیر ہو گئی ہوتیں مگر یہ تعداد اسقدر قلیل

ہے کہ اس کو ایک قوم کی نقل و حرکت نہیں کہا جا سکتا۔

سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے کہ آرین ساحل کے ساتھ ساتھ اور سمندر پار کر کے سندھ میں پہنچے۔ یعنی شمال کی طرف سے نہیں آئے۔ اگر شمال کی طرف سے انکی آمد شروع ہوئی تو یہ بہت بعد کا واقعہ ہے۔ جب موسم موافق ہو چکا تھا اور آمد و رفت میں کسی قسم کی رکاوٹ اور دقت نہ تھی جبوقت وادی سندھ سرسبز و شاداب تھی اس وقت ہندوستان کے شمالی سلسلے دائمی طور پر برف سے ڈھکے رہتے تھے۔ ان پر سے عبور ناممکن تھا۔ موسم اسی طرح بدلتے رہتے ہیں اور اب بھی بدل رہے ہیں اس میں تعجب کی کوئی وجہ نہیں اس طرح زرخیز خطے بنجر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور یا لآخر ریگستان بن جائیں گے۔ قریب ہی کی ایک مثال ہے کہ لاہور میں بادام اگا کرتے تھے۔ اور اسی نام کا ایک اسٹیشن بھی موجود ہے جسے بادامی باغ کہتے ہیں۔ اس جگہ پر باداموں کے باغات تھے۔ یہ کوئی دور کی بات نہیں، ہم نے یہ اپنے دادا سے سنا ہے اور اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے وہ ابھی گواہی دینے کے لئے زندہ ہیں تا رئیسِ کرام خود سوچ سکتے ہیں کہ بادام اگنے کیلئے کس قسم کی زمین کی ضرورت ہے اور کس موسم کی۔ مگر اب وہی بادامی باغ ہے کہ ..... بادام کے ایک درخت کا بھی نشان نہیں رہا۔ اسی طرح تبدیلی موسم سے زمین کی زرخیزی بھی اڑ جاتی ہے۔ اور اسی طرح جب عراق و عرب سرسبز اور شاداب تھا تو یورپ برف کے نیچے دبا ہوا تھا۔ گویا جب آرین کے اوّلین گروہ ہندوستان آئے تو وہ شمال کی طرف سے نہیں آئے تھے، ایک تو یہ کہ ادھر سے عبور کرنا مشکل تھا اور دوسرے یہ کہ ہمیں اب جو کتبات اور مہریں[1]

---

[1] مہریں یعنی SEALS. اس چیز کو کہتے ہیں جو پچھلے زمانہ میں لوگ بطور مہر کے استعمال کرتے تھے۔ یہ ایک مٹی کی گول ساخت ہوا کرتی تھی جس پر ایک خاص قسم کا نشان یا شخص کا نام کندہ ہوتا تھا۔ یہ مہریں دھوپ میں پکائی جاتی تھیں (SUN BAKED) ان کے اندر ایک سوراخ رہتا تھا جس میں سے دھاگا پرو کر لوگ گلے میں ڈال لیا کرتے تھے۔ جس طرح آج کل ہم انگوٹھی بطور مہر استعمال کرتے ہیں (باقی صفحہ ۴۵ پر)

Marfat.com

(SEALS -) مل رہی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی آمد و رفت اسی طرف سے تھی جو ہم نے ابھی عرض کی۔

اب رہی یہ بات کہ جو تہذیب ہڑپا اور موہنجو دارو میں برآمد ہوئی ہے یہ کون تہذیب تھی؟ تو یہ ہمیں کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آرین تھی۔ ان کتبات میں زیادہ تر کاروباری معاملات مذکور ہیں یعنی (BUSINESS TRANSACTIONS) یہ کاروباری معاملات وادی سندھ کے لوگوں اور ہلالِ خصیب کے لوگوں کے درمیان ہوتے رہے ہیں جن کی آپس میں جان پہچان تھی اور اکثر یہ آپس میں بھائی بندی ہوتے تھے۔ انھوں نے آتے ہی اپنا راہ و رسم قائم کر لیا اس سے پیشتر ہمیں کوئی ثبوت اس وقت تک ایسا نہیں مل سکا جو یہ بات ثابت کر دے کہ یہ مہریں دڑاوڑوں کی ساخت تھیں۔ باقی رہی بات کتبات کی اور جو رسم الخط ان پر استعمال ہوا تو ماہرین ابھی اس مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں کہ ان کا حل کس طرح کیا جائے۔ وہ سمجھے ہیں کہ یہ آرین کی ہندوستان میں آنے سے پیشتر والی زبان ہیں یعنی سامری اگر یہ بھی مان لیا جائے تو اس سے یہ بات کس طرح ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ تحریر دڑاوڑی زبان میں ہے۔ حالانکہ ہمارے پاس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴ کا) اسی طرح یہ مہریں کام کرتی تھیں۔ کتبات اکثر مٹی کی اینٹوں پر لکھے جاتے تھے جب وہ ابھی گیلی ہی ہوتی تھی۔ کتبات لکھے جانے کے بعد اسی گیلی اینٹ پر جس شخص نے وہ لکھی ہوا اپنی مہر سے نشان کر دیتا تھا ان کا استعمال اکثر کاروباری معاملات میں زیادہ نمایاں ہے اور رہنیت سے کاروباری کتبات ایسے ملے ہیں جن پر یہ مہریں ثبت کر دی گئی ہیں بعض مہروں کے بعد جانوروں اور دیوتاؤں کی بھی شکلیں ہوتی تھیں اور بعض میں عبارات کی بھی۔ انسانوں کی بھی شکلیں پائی گئی ہیں۔ نیز کچھ واقعات بھی ان پر منقش ہوئے ملے ہیں مثلاً تین آدمی اگر شکار کھیل رہے ہیں تو ان تینوں کی تصویر معہ جانور کے بنا دی جاتی تھی۔ گیلی مٹی پر جب اس کو دبا کر پھیلایا جاتا تھا تو وہ مہر کا نقش گیلی اینٹ پر اتر آتا تھا۔ پھر اس کو سکھا کر مضبوط کر لیا جاتا تھا اور پھر گلے میں لٹکا کر اسے محفوظ کر لیتے تھے ہڑپا۔ موہنجو دارو۔ اُر۔ بابل اور نینوا اور دوسرے کئی مقامات پر پائی گئی ہیں۔

Marfat.com

اس وقت تک دڑاوڑی زبان کا ایک بھی کتبہ موجود نہیں ؛ زبان کا اختلاف اور رسم الخط میں تفاوت ایک بہت آسان بات ہے۔ آپ پچھلی تین صدیوں میں انگریزی رسم الخط کا ہی ارتقام دیکھئے کس قدر فرق پڑچکا ہے۔ خط کوفی اور جدید عربی تحریر میں کسقدر جلد فرق پیدا ہوگیا تھا۔ دور کیوں جائیے آپ عربوں کی عربی لکھی ہوئی دیکھیئے اور ہم ہندوستانیوں کی۔ آپ کو کتنا نمایاں فرق نظر آئے گا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ پڑھا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی نہ بھولئے کہ اب تہذیب بہت ترقی کر چکی ہے اور ذرائع آمد و رفت میں جو زمان و مکان کا پردہ حائل تھا وہ اب نہیں رہا لہٰذا ایسی تبدیلیاں فوراً پتہ چل جاتی ہیں اور دوسروں کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی اور نہ ہی دیر لگتی ہے۔ چنانچہ ان حاصل شدہ مہروں کی ساخت اور مشابہت اُر اور بابل سے برآمد شدہ مہروں سے اس قدر زیادہ معلوم ہوتی ہے جیسے وہاں ہی سے آئی ہوئی ہیں عمارات اور ہیکلوں کے نقشوں میں بھی بہت مشابہت ہے۔ یہ مہریں اور کچھ کتبات جو حاصل ہو چکے ہیں، ماہرین آثار قدیمہ کا قیاس ہے کہ یہ دو ہزار سات سو (۲۷۰۰) سال قبل مسیح کی ہیں اس سے یہ بھی بات ثابت ہوگئی کہ آرین کا دور ہندوستان میں آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال قبل مسیح اوّل اوّل ہوا۔ ایک اور بات جو بہت نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ جو دیوتاؤں کے نام ہمیں یہاں دستیاب ہوئے ہیں وہی دیوتا ہیں جو آرین کے ہندوستان آنے سے پیشتر کے تھے۔ چند ایک بادشاہوں کے ناموں میں بھی مماثلت پائی گئی ہے۔

جب آرین سندھ پہنچے تو انھوں نے دڑاوڑوں کو وہاں موجود پایا چونکہ اسوقت ہندوستان میں سب سے بہتر اور زرخیز علاقہ وہی تھا اور تہذیب کا مرکز بھی تھا۔ آرین نے اس علاقے پر قبضہ جمایا اور آہستہ آہستہ پرانی تہذیب کو اپنی تہذیب سے بدل ڈالا۔ آرین بھی جب ہندوستان پہنچے تو حد درجہ مہذب تھے اور انکی تہذیب اس وقت کی ترقی یافتہ اقوام میں سب سے بہتر تھی۔ پھر جب شمال ہندوستان کا موسم موافق ہوتا چلا گیا تو یہ بھی شمال کی طرف بڑھتے گئے اور پنجاب پہنچے اور وہاں سے ہوتے ہوئے وادیٔ گنگ میں وارد ہوئے۔ ان علاقوں پر جب یہ پوری طرح قابض

Marfat.com

ہوگئے تو پھر انھوں نے اپنی تہذیب کا پرچار شروع کیا۔ اپنی تاریخیں اور مذہبی صحیفے مکمل کرنا شروع کر دیئے جو اس وقت تک چلے آتے ہیں۔ اور بہت حد تک محفوظ ہیں۔

بال گنگادھر تلک (B G. TILAK.) اپنی کتاب ARTIC HOME IN THE VIDAS. میں رقمطراز ہیں کہ آرین دیوتاؤں کی صفات تمام تر قطبی ہیں یعنی (POLAR ATTRIBUTES) یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی اور اب ناپید ہے۔ ان قطبی صفات سے موصوف کی مراد یہ ہے کہ آرین درحقیقت قطب شمالی کے باشندے تھے اور جو جو دیوتا یہ ساتھ لائے ان کی صفات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام قطبی شمالی سے متعلق ہیں۔ قطبِ شمالی سے یہ وسط ایشیا میں پہنچے۔

تو گویا ان کے مذہب میں (STEPPES OF CENTRAL ASIA) خلل پیشتر ہی سے پڑ چکا تھا جو عوام میں رائج ہو چکا تھا۔ اگرچہ ان میں ایک ایسا گروہ ہر وقت رہتا تھا جو اصل مذہب سے واقف تھا۔ چنانچہ آج کل بھی دیکھ لیجئے۔ اب تو خیر تعلیم یافتہ دیوتاؤں اور تثلیث کے قائل ہی نہیں رہے اور اصل چیز کی طرف آ رہے ہیں۔ تلک صاحب دیگر ذرائع کے علاوہ رمل اور نجوم کے ذریعے بھی اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں بھی یہ درست معلوم ہوتا ہے کہ ..... اقوام کی گردش ایک مدت طویل سے جاری ہے اور دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں انسان ایک دفعہ پہنچ کر اپنے اصلی مقام کی طرف نہ لوٹا ہو۔ اور پھر وہاں سے یا رد گرد دوسری سمت میں ہجرت نہ کر گیا ہو۔ اس کی وجوہات مختصراً یہ ہیں کہ اول موسموں کا تغیر اور دوسرے تلاش معاش اور سب سے بڑی ایک یہ بھی وجہ تھی جو ہم نے ابھی سطور بالا میں عرض کی ہے یعنی بڑھتا اقتدار اور تسلط کی حرص۔

اگر تلک صاحب کا یہ نظریہ درست مان لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ قطب شمالی سے آرین اس وقت لوٹے جب وہاں کا موسم قابلِ رہائش نہ رہا اور سخت سردی اور برف کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اول دفعہ انھوں نے موجودہ مذہب کا تخیل وہاں پر قائم کیا کیونکہ ان کے تمام

دیوتاؤں کی صفات پولر یعنی قطبی ہیں۔ اور جب یہ وہاں گئے تو یقیناً انکا مذہب مختلف شکل میں ہوگا۔ اور یہ وہاں پہنچے بھی ہوں اسی راستے سے جدھر سے واپس لوٹے یعنی وسطِ ایشیا سے ہو کر ان کا آتے وقت وسط ایشیا میں زیادہ وقت قیام نہیں ہوا۔ یہ سیدھے ہلالِ خصیب میں چلے آئے۔ لاسہ جو انکا قدیم مذہبی مرکز تھا تو اس کی بنیاد انھوں نے غالباً جاتے وقت رکھی ہوگی۔ اور ممکن ہے جب یہ واپس لوٹے ہوں تو یہاں پر موسم قابلِ رہائش نہ رہا ہو، اسی وجہ سے یہ ایران اور ہلالِ خصیب کی طرف بڑھے۔ کیونکہ یہ علاقے اس وقت دنیا کے بہترین اور زرخیز علاقوں میں سے تھے۔ سندھ اور عراق کی آب و ہوا میں بہت حد تک مماثلت ہے۔ لہذا یہ علاقے زمانۂ قدیم میں بھی ایک ہی قسم کا موسم رکھتے تھے اور اس میں تغیر بھی بیک وقت ہوتا رہا ہوگا خطِ میخی کے قدیم کتبوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان علاقوں میں بہت باغات موجود ہوا کرتے تھے اور پہاڑ بھی درختوں سے ڈھکے رہتے تھے اور چشمے رواں تھے۔ مگر اب سب کچھ معدوم ہو چکا ہے۔

اب تک ہم نے اس باب میں وادیٔ سندھ اور ہلالِ خصیب کے تعلقات بیان کئے ہیں اور ہمارا مقصد اس عرصۂ طویل کی داستان بیان کرنے سے یہ تھا کہ آیتِ قرآن قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ جس طرف اشارہ کرتی ہے اس کا تاریخی معائنہ کروا دیا جائے۔

اب ایک اور امر بھی غور طلب ہے۔ جدید نسبی نفسیات میں بہت سے ایسے نظریات موجود ہیں جو عرب مورخین سے اخذ کئے گئے ہیں۔ قرونِ اولےٰ میں جو نسبی تقسیم پر زور تھا، تو اس میں مورخین کے پیشِ نظر ایک چیز تھی اور وہ یہ کہ سامی نسل سب سے بہتر اور تہذیب یافتہ قوم تھی۔ اور اس ہی کی بدولت دنیا میں چاروں طرف تہذیب و تمدن پھیلا۔ ان محققین کو غالباً اس وقت غیر سامی اقوام کا علم نہ تھا اور انکی دنیا ایک محدود رقبہ رکھتی تھی۔ ذرائعِ آمد و رفت آسان نہ تھے اور سیر و سیاحت کا شوق اگرچہ تھا تاہم یہ بھی

Marfat.com

محدود تھا۔ عربوں نے جب جہاز رانی شروع کی تو یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں انکے جہاز دور دراز ملکوں میں جایا کرتے تھے تو یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہم لوگوں کے پاس اس زمانے کے ریکارڈ موجود نہیں ہیں جس سے اس بات کی تصدیق ہو سکے۔

آپ دنیا کا نقشہ اٹھا کر دیکھئے اور وہ بھی دیکھئے جو اوّل عربوں نے بنایا اور پھر اس پر بھی نظر دوڑائیے جو بابلیوں نے تجویز کیا۔ دجلہ و فرات کی وادی بابلیوں کے لئے ان کی دنیا تھی اور ان کے چار ہزار سال بعد تقریباً یہ دنیا صرف اس قدر بڑھ سکی کہ عربوں نے اس کا حدود اربعہ بحیرۂ متوسط سے بحیرۂ خضر تک محدود کر دیا یہ علاقے ان کے لئے وہ تھے جہاں سے سورج چڑھتا اور جا کر غروب ہوتا۔ لہٰذا جو اقوام ان کے اندر موجود تھیں ان سے یہ لوگ واقف تھے اور جو باہر سے آ کر آباد ہوئی تھیں ان سے بے بہرہ تھے اور قطعاً واقفیت نہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے اس تنازعہ کی جو طوفانِ نوح سے متعلق ہے یعنی طوفانِ نوح خاص تھا یا عام؟ یعنی تمام دنیا پر تھا یا کہ صرف ایک خاص خطے کے ساتھ منسوب تھا۔ جو لوگ طوفان کے زمانہ میں موجود تھے ان کے لئے تو وہ عام ہوگا کیونکہ انکی دنیا وہی تھی جہاں وہ موجود تھے۔ اور جہاں ہم آج کل ہیں تو ہمارے لئے وہ خاص ہوگا کیونکہ یا تو اس کا تعلق ان علاقوں سے ہے۔ جن کا سامی صحائف ذکر کرتے ہیں اور یا وہاں ہے جہاں آرین صحائف ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے لئے وہ علاقے اب مختصر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ اب معدوم ہو گیا ہے جو گذشتہ زمانے میں معدوم نہ تھا۔ غرضیکہ گذشتہ اقوام کے لئے تو طوفان عام تھا مگر فی زمانہ کے لوگوں کے لئے جنکا مطالعہ اور معلومات بہت وسیع ہیں، طوفان ایک خاص جگہ کے ساتھ مخصوص ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب تو گویا قرونِ اولیٰ کے مورخین اور محققین کی نگاہیں دور رس نہ تھیں۔ ایک بات اور یہ تھی کہ ان لوگوں کی معلومات کا تمام تر دارومدار آسمانی صحائف پر تھا۔ اس لئے انھوں نے تمام قصص اپنے ہی ساتھ منسوب کر لئے۔ کیونکہ وہ ان کے خطے میں نازل ہوئے تھے۔

Marfat.com

یورپین مستشرقین مورخین اور محققین کے گروہ جو اس بات کے درپے ہیں کہ جدید معلومات کی تطبیق گذشتہ مورخین کی تحقیق کے ساتھ کردی جائے مایوس الجھاؤ میں پڑ گئے ہیں کہ اقوام کی تقسیم کے موجودہ نظریئے کا رشتہ قدیم نسبی تقسیم سے کس طرح منطبق لیا جائے۔ اس تمام خلل کا باعث غیر سامی یعنی آرین اقوام ہیں جن کا پتہ کچھ تھوڑا ہی عرصہ ہوا چلا ہے۔ ہلالِ خصیب کی تہذیب میں دونوں کا ہاتھ نمایاں ہے یعنی سامی اور غیر سامی اور خاص کر مملکتِ آشور میں تو بہت ثبوت بہم پہنچ چکے ہیں یعنی وہاں کی تہذیب زیادہ تر سامی تھی اگرچہ مخلوط تمدن کے آثار بھی بکثرت موجود ہیں۔ اس صدی کی تحقیقات کے تطابق اگر سائنٹیفک لحاظ سے کیا جائے تو ان میں تواتر کو قائم رکھنا آسان نہیں اور اگر آسمانی صحائف ہی پر اعتماد منحصر ہو تو پھر اس سلسلہ میں ایک اور رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ نسبی ساخت کی وجہات کا بیان ہمیں کہیں نہیں ملتا۔ ہمارے نظریئے کے مطابق سب سے پہلے جو چیز ہم نے فرض کی تھی وہ یہ تھی کہ نسل انسانی۔ انسان اوّل یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی۔ انکی اولاد بڑھتے بڑھتے مختلف مقاموں پر پھیل گئی۔ جہاں مدت ہائے دراز کے بعد اختلافِ آب و ہوا نے انکی اصلی نسبی ساخت میں اختلاف پیدا کر دیا۔ اور یہ ایک ایسا امر تھا کہ ضرور ہوتا۔ لہٰذا جب شکل و شباہت میں اختلاف واقع ہو گیا تو ایک نے دوسرے بچھڑے ہوئے کو اپنا نہ بنایا اور اسے غیر سمجھا۔ جو رنگت میں سفید رہ گئے تھے انھوں نے کالوں سے نفرت شروع کر دی اور جو کالے رہ گئے تھے انھوں نے خود بخود علیحدگی اختیار کر لی اور سفید رنگ والوں سے پرہیز شروع کر دیا۔ بعد میں جب مورخین کے سامنے یہ بات پہلی مرتبہ ظاہر ہوئی۔ تو انھوں نے تمام اقوام کو ان علاقوں کے ساتھ منسوب کرنا شروع کر دیا جو انکی دانست میں تھے۔ بعض علم الاقوام کے ماہرین نے اقوام کی تقسیم محض اسی لئے کی کہ انکا تمدن و تہذیب، ان کے اخلاق و عادات، اور اعتقادات علیحدہ علیحدہ تھے اور سب سے آخر میکس مولر (MAX MULLER) نے زبان کے لحاظ سے اس تقسیم پر مہر ثبت کر دی۔ زبان کی وجہ سے جو یہ تقسیم ہوئی تو اس نے اور پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ لوگوں نے زبان کے ساتھ

ایک خاص قوم کو منسوب کر دیا اور اس نے آگے چل کر ایک نہایت اہم شکل اختیار کر لی۔ اور تمام دنیا کے تمدن و تہذیب کا دارومدار اسی ایک قوم کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ یہ تمام تقسیمیں ہماری نگاہ میں زہرِ قاتل ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انسانیت کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ مذہب بھی ایک ہی ہے اور تہذیب کا اختلاف ماحول اور اختلافِ موسم کی وجہ سے ہے۔ گذشتہ زمانہ میں کیوں جائیے آج کل ہی کی مثال ملاحظہ کر لیں۔ ایک خاندان کے کچھ افراد فرض کیجئے مختلف ممالک میں بکھر گئے ہیں۔ اور فرض کیجئے وہاں ان کا قیام دس برس تک ہوا ہے اب یہ بھی فرض کیجئے کہ ان میں سے ایک انگلستان، دوسرا وسطِ افریقہ اور تیسرا صحرائے عرب میں جا کر جاگزیں ہو گئے ہیں۔ دس برس کے بعد یہ تمام افراد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اب ان میں جو فرق نمایاں ہو گیا ہے وہ قابلِ انکار نہیں ان کی رنگت، ڈیل ڈول، بود و باش، گفتگو اور نشست و برخاست میں مقام کے مطابق، جہاں انھوں نے یہ دس سال گذارے ہیں۔ فرق پڑ گیا ہو گا۔ یہ بات مدِ نظر رہے کہ یہ عرصہ دس برس کا قلیل عرصہ ہے اگر اسکو بڑھا کر تین چار ہزار تصور کر لیا جائے تو آئندہ آنے والی نسلوں میں کس قدر نمایاں اختلاف واقع ہو جائے گا۔ تو پھر اس بات پر تعجب کیوں ہو کہ گذشتہ ایام میں بھی ایسا ہی ہو آیا ہے اس کے علاوہ نسلوں کا آپس میں باہم نفسیاتی اختلاط اور رابطہ بھی نسلوں کی رنگت و شکل و شباہت کو بدل دیتا ہے۔ کیوں ایک قوم کو دوسری قوم پر ترجیح دی جائے۔ اس لئے کہ ایک کا رنگ سفید رہ گیا ہے اور دوسرا کالا ہو گیا ہے! کیا سب کا مذہب اور تمدن ایک ہی سرچشمہ سے ابھرا ہوا نہیں؟ اللہ تعالےٰ قوموں پر ان کے دن پھیرتا رہتا ہے اسی طرح مختلف اقوام مختلف وقتوں میں ترقی کرتی رہتی ہیں باقی صفحہ ہستی سے معدوم ہو جاتی ہیں۔ جس طرح تخلیق کائنات میں ہر ذرہ تنازع البقاء اور بقائے اصلح کا قانون رکھتا ہے بعینہٖ اسی طرح یہ قانون اقوام کے لئے بھی ثابت ہے۔

ہمارے نزدیک اقوام کی تقسیم اتنی اہم نہیں ہے کہ اسپر زیادہ زور دیا جائے۔ جو بات غور طلب ہے وہ ان اقوام کی نسبتی کی حقیقت کی تصدیق ہے نہ کہ تقسیم۔ اقوامِ نوح، لوط، عاد، ثمود اور غیرہم ایک زمانے میں موجود تھیں اور ان کے متعلق آسمانی صحائف میں جو کچھ درج ہے

Marfat.com

وہ لفظ بلفظ درست ہے ہمیں ان کے نتائج سے اپنا انجام اخذ کرنا چاہیئے نہ کہ گذشتہ قوموں کی تاریخ کا مضحکہ اڑانا چاہیئے۔

ان کے مذہب اور انکی تہذیب کا تعلق ہمارے اخلاق اور تہذیب پر ہے اور ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی موجودہ حالت کو گذشتہ قوموں کے انجام پر پرکھ کر صراطِ مستقیم اختیار کریں۔

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ (احقاف)

برادر عاد کو یاد کرو جب احقاف میں اس نے اپنی قوم کو ڈرایا!

ہم ان کے آثار ملاحظہ کرتے ہیں مگر ہمارے دل میں کبھی بھی یہ خیال نہیں کھٹکا کہ اس سے کیا نتائج اخذ کریں، ہم شاید یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہمیشہ اسی طرح رہیں گے اور جو جی چاہے کریں مواخذہ نہ ہوگا۔ اللہ تعالےٰ نے قوم عاد کو اسی بات پر متنبہ کر دیا تھا اور یہی بات آج کل ہم پر بھی بعینہٖ عائد ہوتی ہے:۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (شعراء)

اے عاد والو! تم ہر مقام پر بے فائدہ یادگار اور کاریگری کے مقام بناتے ہو۔ شاید تم (سمجھتے ہو کہ) دنیا میں ہمیشہ رہو گے!

اگر ان آثار کو دیکھ کر بھی اس بات کا احساس پیدا نہ ہو، تو پھر ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا اور حاصل کیا!

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (الفجر)

تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے اس عادِ ارم کے ساتھ کیا کیا، جو بڑی بڑی عمارتوں والا تھا جس کی نظیر دنیا میں نہیں پیدا کی گئی۔

باب (۲) دوئم

تاریخ کے دورِ آغاز میں مختلف آرین قومیں

گذشتہ باب میں ہم نے تاریخِ قدیم کے چند پہلوؤں پر گفتگو کی اور اسی ضمن میں دجلہ و فرات اور وادیٔ سندھ کی تہذیبوں کا جستہ جستہ ذکر کیا اب اس باب میں ہم ان اقوام کا ذکر کریں گے جو وقتاً فوقتاً ادھر آ کر بستی رہیں۔

ہم ذیل میں پہلے ایک مختصر سی فہرست درج کرتے ہیں جس میں وہ تمام اقوام آ جائیں گی جن کا تذکرہ مقصود ہے اور قارئین کرام ان ناموں سے مانوس ہو جائیں گے۔ یہ اقوام مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) سومیری (SUMMERIANS)

(۲) آکادی (AKKADIANS)

(۳) میتانی (MITTANIS)

(۴) حتّی (HITTITES)

(۵) آشوری (ASSYRIANS)

(۶) عیلامی (ELAMITES)

(۷) مادی (MEDIANS)

(۸) صوبیری (SUBERIANS)

Marfat.com

ان میں سے کچھ اقوام کا نام اکثر سنا گیا ہوگا اور کچھ ان میں سے ایسی ہیں جن کے متعلق بہت کم معلوم ہے ہم مختصر طور پر یہاں ان کی تاریخ بیان کریں گے۔ اور بعض اقوام کے تعلقات بھی بیان کریں گے آشوری قوم کے لئے ہم نے ایک علیحدہ باب اخیر میں اضافہ کر دیا ہے کیونکہ اس قوم کی مزید تاریخ مذہبی نقطۂ نگاہ سے ہمیں اہم معلوم ہوتی ہے۔ ان اقوام کا تعلق جہانتک دوسری اقوام اور ممالک کے ساتھ تھا وہ بھی بیان کر دیا ہے۔

لَعَلَّ اللّٰہ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا

سومیری ہم گذشتہ باب میں لکھ چکے ہیں کہ یہ غیر سامی یعنی آرین تھے۔ دجلہ و فرات کی وادی میں سب سے پہلے تہذیب کا پرچم انھوں نے ہی لہرایا۔ ان کو سومیری محض انکی زبان کے لئے کہا جاتا ہے کیونکہ جب کتبات خطِ میخی حل ہوئے تو ماہرین نے اس زبان کو سومیری زبان یعنی SUMMERI ANLANGUAGE کہہ کر پکارا۔ اس وقت تک اس قدر ثابت ہو چکا ہے کہ یہ لوگ غیر سامی یعنی (NON SEMET.C) ہیں۔ یہ علاقہ بابل کے جنوبی حصہ کے باشندے تھے اور اس علاقے کو مات شمری (MAT SHUMRI) کہا جاتا تھا۔ یہ آرین کا سب سے پہلا گروہ تھا جو ایران سے عراق میں آیا اور میڈیا یعنی ماد (MEDIA) اناطولیا اور آشور سے ہوتا ہوا بابل کے جنوب میں مات شمری پر پہنچکر آباد ہو گیا۔ انہی میں سے کچھ گروہ میڈیا اور آشور میں بس گئے۔ ان کی تاریخ کا اب بوغاز کوئی BOGHAZ KUI کی تنقیب سے پتہ چل رہا ہے۔ تو گویا یہ اولین گروہ تھا آرین کا جو ہلال خصیب کے جنوبی حصہ میں پہنچا۔ اور اسی گروہ کا کچھ حصہ تھا جو وادی سندھ میں بھی جا پہنچا۔

آکادی ان کے متعلق ماہرین آثریات اور مستشرقین ابھی تک بہت تش و پنج میں ہیں اور کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے۔ کچھ تو کہتے ہیں کہ یہ سامی (SEMETIC) تھے اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ ایک مخلوط قوم تھی۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ یہ غیر سامی (NON SEMETIC) تھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی آرین تھے اور یہ انہیں سومیری اقوام میں سے تھے جو کچھ عرصہ ان سے پہلے اس

علاقہ سے ہو کر جنوب کی طرف بڑھ چکی تھیں۔ جس علاقہ میں یہ قوم آباد تھی اس کو مات آکادی بھی کہا جاتا تھا (MAT AKKADI.) اور یہ علاقہ تقریباً ہلالِ خصیب کا وسط بنتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ وادیٔ دجلہ و فرات کا شمالی حصہ۔ بعض مستشرقین نے اس نام کا حل آغاد (AGHADE) بھی کیا ہے۔ اور بعض نے اسی علاقہ کو علاقہ ایودھیا (AYODHYA) جس کا ذکر ہم مہابھارت میں پڑھتے ہیں، کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہاں کے بادشاہوں کی فہرست میں ایک بادشاہ کا نام دسرتھ (DASARATHA) حل ہوا ہے جس کا ایک لڑکا نرم سن یا امر سین (NARAM SIN AMARSIN) تھا۔ ان کے کارناموں کے حالات مہابھارت کی کہانی سے بہت کچھ تطابق رکھتے ہیں۔ ہم اس کی تفصیل آئندہ کریں گے انشاء اللہ تعالےٰ۔

ان اقوام کی تاریخ کے متعلق مختلف خیالات ہیں، مگر یہ سب نظریئے ہیں اور ماہرین کے ذاتی فکر کا نتیجہ ہے، ایک بات ہم ضرور جانتے ہیں اور وہ یہ کہ ان تمام اقوام کا سرچشمہ ایک ہی تھا

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ ابتدا میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ نہ تھے یعنی گروہوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے ایک ہی قوم اور جماعت تھے۔

گردشِ اقوام ایک عرصۂ طویل سے جاری تھی، ہمارے پاس اس گردش کا مکمل پروگرام موجود نہیں اور نہ ہی عقل و فہم اس عرصہ کا اندازہ لگا سکتی ہے۔ ہم جتنے عرصے سے ان قوموں کا ذکر سنتے ہیں یہی سمجھتے ہیں کہ یہ اقوام مختلف النسل ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک تاریخ و قرآنِ کریم ہمیں پتہ دیتے ہیں، اتنا ضرور علم ہے کہ ہلالِ خصیب زمانۂ قدیم سے ایک مستقل مملکت تھی جس میں دو گروہ آباد تھے، قرآن کریم نے ان کا نام عاد اور ثمود لیا ہے۔ ہم ان دونوں کا ذکر اس کتاب کے آخری باب میں بالتفصیل کریں گے۔ ان دونوں قوموں کے مسکن مختلف تعین کئے جا چکے ہیں، تاہم قومِ ثمود ہلالِ خصیب کے اس حصہ میں بھی آباد تھی جو حجاز اور شام کے درمیان ہے اور وادیٔ القریٰ تک چلا گیا ہے، مگر ایک زمانہ میں اس علاقے کا پھیلاؤ بابل کے جنوب سے ہوتا ہوا

Marfat.com

شہر اُر (UR) تک پہنچتا تھا۔ دوسرا علاقہ جس میں قوم عاد آباد تھی اس کو ارم کہا گیا ہے۔
درحقیقت ارم، عاد کے دادا کا نام تھا اور اسی نام کے ساتھ یہ علاقہ بھی منسوب کر دیا گیا۔
یہ علاقہ ہلالِ خصیب کا شمال اور شمال مغرب ہے اور اس کا حدود اربعہ تقریباً وہی ہے جو بات آکادی کا تھا۔ ایک اور نظریہ یہ بتاتا ہے کہ ارم ایک قدیم شہر تھا یا ایک ملک، جہاں کے باشندے عاد کہلاتے تھے۔ اگر نقشہ کو بغور دیکھا جائے تو یہ علاقہ جہاں عاد اور ثمود آباد تھے وہی علاقہ ہے جس کو ہم نے ہلالِ خصیب کہا ہے۔ اور یہ اقوام جن کو عاد اور ثمود کہا ہے، آکادی اور سومیری ہی ہیں محض کتبات خطِ میخی کے حل کے وقت ان الفاظ میں نقل واقع ہو گئی۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوا۔ ان اقوام کی تہذیب کا جو ذکر قرآنِ کریم نے کیا ہے وہ ایک یقینی امر ہے۔

سڈنی سمتھ (SYDNEY SMITH) اپنی مشہور تاریخ EARLY-HISTORY OF ASSYRIA میں لکھتے ہیں کہ ۳۵۰۰ سنہ سے لے کر ۲۷۰۰ سنہ قبل مسیح کے درمیان مملکتِ بابل میں ایک متجانس تہذیب موجود تھی جس کا ثبوت ہمیں مقام کیش (KISH) میں ملا ہے اور جو لوگ اس وقت یہاں آباد تھے ان کی زبان سومیری زبان کے کتبات سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ جس تہذیب کو وہ درحقیقت ایک مخلوط تہذیب تصور کرتے ہیں، وہ دراصل مخلوط نہ تھی، بلکہ یہ زمانہ ایک عارضی کشمکش کا تھا اور اس دوران میں پے درپے شمال کی طرف سے دیگر اقوام حملہ آور ہوتی رہیں۔ اور ایک کی تہذیب نے دوسری پر اثر کیا۔ مقام کیش چونکہ اس وقت تہذیب کا مرکز تھا، اس لئے زیادہ اثر وہاں ہی نمایاں ہوا۔ اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہاں واقعی تہذیبیں مل جل چکی تھیں۔ کیش کے گرد و نواح میں یہ چیز بالکل نمایاں نہیں ہے اور نہ ہی علاقہ بابل کے کسی اور خطے میں ایسا ثبوت ملا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ وادی سندھ میں جو مہریں (SEALS) برآمد ہوئی ہیں ان پر بھی وہی نقش و نگار ہوتے ہوئے ہیں جو سومیری مہروں پر ملے ہیں۔ سڈنی سمتھ (SYDNEY SMITH) اس بنا پر بابل کی تہذیب کو ایک مخلوط تہذیب تصور کرتے ہیں۔ وادی سندھ کی تہذیب کو بھی اگر اسی ثبوت کی بناء پر ایک مخلوط تہذیب مان لیا جائے تو وہ بھی محض ایک منافی چیز تھی حقیقت کہ سومیری

Marfat.com

سندھ میں پہنچے اور دراوڑوں کے ساتھ ان کی مڈبھیڑ ہوئی، اس کے کچھ ہی عرصہ بعد تہذیب کی شکل بدل چکی تھی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ذیل میں ایک نقشہ ہلال خصیب کا بنا دیا جائے جس میں ان مختلف اقوام کا نشان دیدیا جائے جہاں جہاں یہ بکھری ہوئی تھیں۔

میتانی تاریخی لحاظ سے یہ قوم بہت اہم معلوم ہوتی ہے۔ اس کی مختلف شاخوں، اور اس کے بادشاہوں کے نہ ہی صرف نام نسب بلکہ قریبی ممالک سے جو تعلقات ثابت ہو چکے ہیں وہ بہت دلچسپ اور اہم ہیں اس قوم کو ہوری (HURRI) بھی کہا گیا ہے جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں عرض کیا تھا اور کہا تھا کہ شہر اُر اسی نام کے ساتھ وابستہ ہے اور اسی قوم کو شہر لاہور کے ساتھ ایک گونہ مماثلت ہے۔ اس ضمن میں نامناسب نہ ہوگا کہ لاہور کے قدیم ہونے پر کچھ تھوڑی بہت تحقیق قارئین کرام کے سامنے پیش کر دی جائے۔

یہ امر واقعی ہے کہ لاہور ہندوستان کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے، بلکہ کچھ بعید نہیں کہ مستقبل کا مورخ یہ بات ثابت کر دے کہ لاہور کا زمانہ ہڑپا اور موہنجوداڑو کا زمانہ ہے جو لوگ لاہور کے رہنے والے ہیں، یا جن کو کبھی غور کی نظر سے لاہور کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے تو وہ یہ جانتے ہوں گے کہ لاہور کا پرانا شہر فصیل کے اندر واقع ہے اور گرد و نواح کی زمین سے اصل شہر بلندی پر واقع ہے۔ یہ بات شہر کے جنوبی حصہ سے اسقدر واضح نہیں، جتنی شمال کی جانب سے نمایاں ہے۔ اور اگر اس شہر کی فصیل کے ساتھ ساتھ ہو کر دیکھا جائے تب بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ لاہور کا اصل شہر ایک ٹیلے پر واقع ہے یعنی ایک MOUND پر۔ اس میں شک نہیں کہ متعدد شہر اس قسم کے بھی موجود ہیں جو واقعی پہاڑیوں پر بنائے گئے تھے۔ عہد مغلیہ کے بہت سے قصبے اب بھی موجود ہیں جو پہاڑیوں پر بنائے گئے تھے، مگر یہ جو ٹیلے (MOUND) جن کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے ایک مختلف چیز ہے۔ لاہور کے متعلق یہ حقیقت اور اچھی طرح سے واضح ہو سکتی ہے اگر ہم شہر کے اندر داخل ہو کر اس کے مختلف گلی کوچوں میں سیر کریں تو معلوم ہوگا کہ متعدد گلیاں ایسی ہیں جہاں پہنچنے کے لئے بیس یا تیس سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں اور بہت سے بازار ایسے ہیں جنکی سڑکوں میں بہت نمایاں نشیب و فراز ہے یہ بات خود ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ شہر ایک ٹیلے پر واقع ہے۔

جن اصحاب نے مشرق وسطیٰ کی سیر کی ہوگی اور انھیں قدیم شہر یا ان کے آثار دیکھنے کا

Marfat.com

موقعہ ملا ہوگا تو وہ فوراً یہ چیز سمجھ جائیں گے، کہ تمام قدیم شہر اوران کے آثار بلندی پر واقع ہیں۔ جو نوآباد ہیں وہ بالکل لاہور کی طرح ہیں۔ عراق میں کرکوک، اربیل اور موصل کے شہر سب سے قدیم شہر ہیں جو اس وقت موجود ہیں۔ اور اربیل کے متعلق تو ماہرین کا خیال ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ قدیم شہر ہے جو متواتر آباد چلا آیا ہے اور معدوم نہیں ہوا جس طرح بابل اور آشور ہو گئے یہاں پر اکثریت آج کل شافعی مسلمانوں کی ہے۔

اسی طرح دمشق کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اور جو آثارِ قدیمہ اس وقت موجود ہیں مثلاً بابل اور آشور (قلعہ شرکت) تو وہ بھی ٹیلوں ہی پر واقع ہیں۔ موصل کے قریب ہی جہاں حضرت یونس علیہ السلام کا مزار ہے تو وہ حصہ بھی اس وقت بلندی پر واقع ہے۔ ہم اس ٹیلے کا ذکر تفصیل کے ساتھ آخری باب میں بیان کریں گے۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔ یہ ٹیلہ بہت قدیم مقام ہے۔ اسی ٹیلے کے قریب ہی نمرود ہے۔ فاصلہ تقریباً پندرہ میل کا ہے اور نمرود نبی یونس کے مزار سے شمال مشرق کی طرف ہے اس کے آثار بھی ایک ٹیلہ پر موجود ہیں۔ گویا شہر کی بلندی اور اس کا ٹیلہ پر واقع ہونا ایک اس امر کی دلیل بن گئی ہے کہ شہر قدیم ہے۔

یہ ٹیلے کہاں سے آئے اور کیوں بنے اور شہر ان پر کیوں آباد ہوئے، تو اس سے متعلق ماہرینِ آرکیالوجی (ARCHIOLO GISTS۔) کا یہ نظریہ ہے۔ کہ دراصل ایک بستی پیشتر ہی سے موجود ہوتی، زمانے کے حوادث کی وجہ سے یہ بستی نیست و نابود ہو جاتی۔ مگر بعد میں آنے والے لوگ اس مقام کا موزوں محلِ وقوع دیکھ کر اپنا ڈیرہ یہاں لگا لیتے اور اس گری ہوئی بستی کو دوبارہ آباد کر لیتے اور اکثر جن اینٹوں سے یہ نئی عمارات تعمیر کرتے وہ اسی پچھلی برباد شدہ بستی کی ہوتیں۔ یہ سلسلہ متواتر کئی ہزار سال تک جاری رہا۔ شہر گرتے رہے اور بنتے رہے۔ پھر گرد و نواح کی مٹی اور ریت آندھیوں کی وجہ سے اُڑ اُڑ کر یہاں جم جاتی اور یہ مقام سطح زمین سے بلند ہو جاتا۔ غرضیکہ اسی اصول کے مطابق جو شہر ان جگہوں پر آج کل موجود ہیں وہ کچھ بلندی پر واقع نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں ہوا کہ وہاں پیشتر ہی سے کوئی بلندی موجود تھی اور اس پر معماروں نے شہر کی تعمیر شروع

Marfat.com

کر دی بلکہ یہ ایک اتفاقی امر تھا۔

چنانچہ یہی وہ لاہور قدیم شہر ہے جس کو ہوری لوگوں نے جو میتانیوں ہی کی اولاد تھے، آباد کیا

اور یہی وہ میتانی ہیں جن کی اولاد میں سے آج کل ہم کُرد، بلوچ اور ہور (جو آج کل سندھ میں مقیم

ہیں) گروہوں کو دیکھتے ہیں۔ آج کل بھی یہ تمام گروہ نہایت دلیر اور جنگجو مشہور ہیں۔ انہی کردوں

کے اباؤ اجداد کورو (KURU) تھے جن کا ذکر مہابھارت میں مذکور ہے۔ ہم اس سے متعلق

تفصیل کے ساتھ آئندہ بحث کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

جب یہ لوگ مملکتِ آکاد پر حکمراں تھے تو ان میں ایک بادشاہ پیدا ہوا جس کا نام خط

میخی کے کتبوں سے دسرتھ (DASARATHA -) حل ہوا ہے۔ اس بادشاہ کی ایک

نہایت دلچسپ خط و کتابت فرعونِ مصر، امینوفس سوئم (AMENOPHUS III) کے

ساتھ ابتک برٹش میوزیم (BRITISH MUSEUM) میں محفوظ ہے۔ یہ خط و کتابت

میتانی زبان میں ہوتی رہی۔ اس بادشاہ کا زمانہ مورخین نے ۱۳۹۴ء سے لیکر ۱۳۲۷ء قبل مسیح

بتایا ہے۔ ہمیں یہ قریب قریب صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اسی میتانی قوم کو ہم آرین کہہ چکے ہیں اور یہ غیر سامی

تھے۔ ماہرینِ آثاریات اور مستشرقین ان کو انڈو ایرانی (INDO-IRANIAN -) کہتے ہیں

یہ بادشاہ اپنے ذاتی عقیدہ کے مطابق آفتاب پرست تھا۔ اور اپنا سلسلۂ نسب اکشواکو کے خاندان

(IKSHAWAKU DYNASTY -) سے ملاتا تھا۔ وہ اس خاندان کا سولھواں فرد تھا۔

اس کو مورو (MURU) کا لقب بھی دیا گیا تھا۔ اس لقب کا مطلب یہ ہے کہ شمالی شام کا سومیری

باشندہ تھا۔

ہمارے اس بیان میں اور پچھلے بیان میں کہ سومیری قوم بابل کے جنوب میں آباد تھی کیسی قدر

تفاوت معلوم ہوتا ہے۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ سومیری قوم درحقیقت ایک زمانے میں تمام

ہلالِ خصیب پر قابض تھی اور پھر آخر یہ بابل کے جنوب میں آکر جمع ہو گئی۔ اس کے کچھ لوگ ہلالِ خصیب

کے مختلف حصوں پر قابض رہے اور یہ بادشاہ دسرتھ بھی انہیں میں سے تھا۔ یہ شمالی شام کا علاقہ

Marfat.com

بعد میں میتانیوں کا علاقہ بنا۔

راماٸن (RAMAYANA.) میں راجہ دسرتھ اور ان کے بیٹے رام چندر (RAMA CHANDRA) کا ذکر ہم نے پڑھا ہے۔ کچھ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی راجہ دسرتھ ہوں۔ ہلالِ خصیب والے راجہ دسرتھ کا ایک بیٹا امرسین (AMAR SIN) تھا اس کے متعلق ہمیں کتبات سے اطلاع ملتی ہے، اور اس کا ایک مجسمہ بھی مل چکا ہے۔ اب ذرا ان دونوں راجاؤں کے درمیان جو تطابق ہے وہ ملاحظہ فرمائیے۔

امرسین (AMAR SIN) اس کو بعض مستشرقین نرم سن (NARAM SIN) بھی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے "چاند والا امر" یعنی (AMAR OF THE MOON) راماٸن والے رامچندر جو راجہ دسرتھ کے بیٹے تھے اور ان کی بیوی کوشلیا کے بطن سے تھے ان کے نام کے معنی بھی یہی ہیں یعنی "چاند والا رام" RAMA OF THE MOON بہت ممکن ہے کہ "امر" (AMAR) کا لفظ رام (RAMA) بن گیا ہو محض نقل کلمہ کی وجہ سے جو ایک قدرتی امر ہے۔ ہم نقل الکلمہ پر ایک مستقل باب باندھیں گے اور قارئین کرام پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دینگے کہ مختلف زبانوں کے لفظوں میں مشابہت ہوتی ہے۔ - - - - - -

- - - - - - - - - -

شاہ دسرتھ کی جو خط و کتابت فرعونِ مصر سے ہوئی تو وہ ایک شادی کے سلسلے میں تھی۔ اور تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ اس بادشاہ کی ایک لڑکی فرعونِ مصر آخنیطون AKHNATON سے بیاہی گئی۔ یہ فرعونِ مصر آمینوفس سوئم (AMENOPHUS III) کا بیٹا تھا اور اس کی والدہ بھی میتانی خاندان ہی سے تھی، اس کی ملکہ کا نام طی (TIY) تھا۔ آخنیطون کے دادا تھوتموسس چہارم (THOTMOSIS IV.) نے ایک میتانی بادشاہ کے نام خط لکھا اور اس کی لڑکی اپنے لڑکے کیلئے مانگی جو بعد میں اس لڑکے آخنیطون کی والدہ بنی۔ اسی طرح آخنیطون کے والد کو بھی معلوم تھا کہ بادشاہ دسرتھ کی ایک حسین بیٹی ہے چنانچہ اس

Marfat.com

دسرتھ کو خط لکھا - یہ تمام خط و کتابت اس وقت برٹش میوزیم میں محفوظ ہے - اس خط و کتابت
ذکر مسٹر ایل - ڈبلیو - کنگ (L. W. KING.) اپنی مشہور تصنیف میں کرتے ہیں
اسی خط و کتابت کا ذکر آرتھر ویگل (ARTHUR WIGALL.) بھی اپنی کتاب
(THE LIFE & TIMES OF AKHNATON.) میں کرتے ہیں -
خط و کتابت کا ذکر انھوں نے خاص طور پر ص ۴۸ پر کیا ہے اور اس شادی کی تفصیل بھی
لکھی ہے -

آخنبطون (AKHNATON) مصری فرعونوں کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے - اور وہ اس لئے کہ یہ توحید کا قائل تھا - اور اس نے بت پرستی اور بت تراشی قطعی ممنوع قرار دے دی تھی - اسی فرعون کی شادی بعد میں جب اس کی پہلی بیوی مرگئی ، ملکہ نفرٹائٹ (NEFFAR TITE) سے ہوئی - حیرت کا مقام ہے کہ جس وقت یہ تخت نشین ہوا اس وقت اس کی عمر صرف ۲۲ سال کی تھی - اور اس نے فوراً ہی اپنے آبا و اجداد کے مذہب میں ترمیم شروع کر دی - اس پرانے مذہب کی رو سے آمن راع (AMON-RA) جو دیوتا تھا اس کی پرستش کی جاتی تھی - مگر اس نے راع کو چھوڑ ایٹن (ATON) کی پرستش شروع کروادی اور خود بھی اپنے نام کے بعد اس کو شامل کر لیا - جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے - (AKHN- ATUN) آرتھر ویگل اس نوجوان بادشاہ کے متعلق رقمطراز ہے :-

"اس نوجوان بادشاہ نے یہ اعلان کر دیا کہ خدا کو ایک ناقابل زوال حقیقت ہونا چاہیئے - نیز یہ بھی ضروری ہے کہ اسے انتہائی درجہ ذہین اور سمجھدار ہونا چاہیئے اور زمان و مکان میں ساری ہو - اس نے کہا کہ ایٹن (ATON) تقریباً ایسا ہی خدا ہے جیسا کہ ہم اسے تصور کرتے ہیں یہ بادشاہ ATON (ایٹن) کی طرف جو صفات منسوب کرتا تھا ان میں سے کوئی صفت بھی ایسی نہیں جن کو ہم اپنے خدا کی طرف منسوب

HISTORY OF BABYLON LONDON PAGES 221, 224 - ؎

نہ کرتے ہوں ۔"

ہماری نگاہ میں اس نوجوان فرعون کے ذہن پر دو اثر بہت شدت سے پڑے، ایک اس کی والدہ کا اور دوسرے اس کی بیوی کا ۔ اور یہ دونوں میتانی خاندان سے تھیں ۔ میتانی آرین تھے اور ہم عرض کر چکے ہیں ۔ آرین کا بھی خالص مذہب وحدانیت ہی تھا ۔ اگرچہ مختلف گروہوں میں مختلف مقامات پر اس عقیدہ کے اندر انحراف پیدا ہو گیا تھا ۔ تاہم ہر زمانے میں ضرور کچھ ایسے آرین رہتے تھے جو اصل مذہب کے پیرو ہوتے تھے ۔ انہیں دونوں سے یعنی اپنی والدہ اور بیوی سے آخنیطون نے توحید کا سبق سیکھا ۔ عورت میں مرد کی نسبت مذہبی احساس زیادہ ہوتا ہے اور چونکہ بچوں پر اولین اثر گھر میں والدہ ہی کا ہوتا ہے، لہٰذا قرینِ قیاس ہے کہ آخنیطون نے اپنی والدہ کے خیالات کی طرف رجوع کیا ہوگا ۔ اور پھر بعد میں جب وہ ایک ایسا ہی عقیدہ رکھنے والی سے بیاہا گیا تو اس کا یقین اور ایمان اور بھی پختہ ہو گیا ۔ اور پھر جب وہ خود مختار ہوا اور فرعونِ مصر بنا تو اس نے توحید کا اعلان کیا ۔

حتّی یہ بھی آرین گروہ کا ایک اولین حصہ تھا جو اناطولیا میں بس گیا تھا ۔ جیسا کہ عام طور تصور کیا جاتا ہے کہ یہ اناطولیا کے ہی باشندے تھے ۔ تو یہ غلط ہے ۔ تاریخ اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ یہ آرین گروہ جس کو حتّی کہا جاتا ہے ۔ اس کے آنے سے پیشتر یہاں ایک اور قوم موجود تھی، مگر ان لوگوں کو حتّی لوگوں نے مار بھگایا ۔

سر پرسی سائیکس (SIR PERCY SYKES.) اپنی کتاب HISTORY OF PERSIA میں فرماتے ہیں کہ یہ جو کتبات ہمیں حال ہی میں بوغاز کوئی (BOGHAZ KUI) میں دستیاب ہوئے ہیں، اور کچھ پیترا PETRA میں تو ان میں کچھ ایسے بھی ہمیں عہدنامے ملے ہیں جو حتّی اور میتانیوں کے درمیان ہوئے ۔

وقت گذرتا گیا اور یہ اقوام آپس میں جذب ہونا شروع ہو گئیں ۔ تا وقتیکہ ان علاقوں میں فقط ایک حکومت رہ گئی ۔ اور ایک قوم بن گئی جس کو ماہرینِ آثارِ قدیمہ آشوری (ASSYRIANS)

کہتے ہیں۔ ہم اس قوم کی تہذیب و تمدن آئندہ باب میں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے یہاں مختصر طور سے انکا تعارف کروا دیا جاتا ہے۔

آشوری یہ قوم بھی آرین ہی تھی۔ اگرچہ ان کے متعلق مورخین اور ماہرین آثارِ قدیمہ میں اختلاف ہے۔ بعض ان کو سامی بتاتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں یہ آرین تھے یعنی غیر سامی، اور ان کے دیوتا۔ آرین ہی کے دیوتا تھے۔ یہ نام ان کا آشور دیوتا کی پرستش کی وجہ سے پڑ گیا تھا۔ چنانچہ اس مملکت کا اوّلین دار الخلافہ بھی آشور ہی کہلاتا تھا جس کو آج کل قلعۂ شرکت کہا جاتا ہے۔ یہ مقام موصل سے جنوب مشرق کی طرف تقریباً ساٹھ میل پر واقع ہے۔ آثار ٹیلوں پر دریائے دجلہ کے کنارے ہے اس کے متصل دوسرے کنارے پر نمرود ہے۔

جب ماہرین نے اس کی کھدائی شروع کی تو یہ تمام شہر جلا ہوا نکلا۔ لفظ آشور کے معانی کے متعلق مسٹر کنگ کی ایک بہت دلچسپ تحقیق ہماری نظر سے گذری ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر اسے یہاں درج کر دیا جائے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب رحمان ہے! ہماری نگاہ میں یہ لفظ آشور، سومیری زبان کے ایک لفظ آ۔ اُسارا (A — USARA) سے بنا ہے جس کے معانی بھی ایک ذات واحد، یا رَبّ کے لئے جا سکتے ہیں اور غالباً ہندوؤں کے بھی جو دیوتا آشور ہیں۔ وہ اسی مفہوم کی صدائے بازگشت ہیں۔ اگرچہ ہندو مہابھارت کی جنگ سے پیشتر آشور دیوتا کا مطلب اچھے معنوں میں لیتے تھے، مگر مہابھارت کی جنگ کے بعد یہ لفظ اچھے معنوں کی جگہ بُرے معنوں میں مستعمل ہونا شروع ہو گیا یعنی بجائے رَبّ کے شیطان سمجھا جانے لگا۔ زرتشتیوں (ZOROASTRIANS) کا اہورمزد (AHUR MAZAD) بھی اس کے ہم معنیٰ ہے، چنانچہ آہور اور آشور ایک ہی لفظ ہیں تقریباً اگرچہ انکا اصل مفہوم اب مفقود ہو چکا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام اسی قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ اور بقول انجیل آپ کو نینوا کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ملا تھا۔ اس مقام پر آپ کی وفات ہوئی اور نینوا (NINEVAH) کے قریب ہی اس وقت آپ کا مزار موجود ہے۔ سارگون دوئم (SARGON II) کے

تھا۔ نینوا آشوری مملکت کا دار السلطنت خورس آباد بن چکا تھا۔ خورس آباد موصل سے تقریباً ۱۲ میل شمال کی جانب ہے۔ اکثر مورخین سارگون کو شرغون بھی کہتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں سارگون اصل لفظ کے زیادہ قریب ہے۔ خورس آباد کے مقام پر ماہرینِ اثریات نے بہت کام کیا ہے اور یہاں سے بہت کچھ تاریخی مواد حاصل ہو چکا ہے۔ ہمیں بھی یہاں سے ایک اینٹ ایک مرتبہ تنقیب کے دوران میں دستیاب ہوئی تھی۔ اس اینٹ پر سارگون دوئم کی مہر ثبت تھی۔ اس وقت یہ اینٹ لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ اس اینٹ کا وزن تقریباً بیس سیر تھا اور اس کی شکل ایک مربع کی مانند تھی جس کی ایک طرف ۱۴" انچ تھی اور اس کی موٹائی ۳" انچ، یہ اینٹ دھوپ میں پکائی ہوئی تھی۔ اس عمل کو (SUN BAKED BRICK) بھی کہتے ہیں اور اس کا رنگ پیلاہٹ پر تھا۔

سب سے دلچسپ سارگون کے محل کے متعلق جو کہ خورس آباد میں تھا، یہ بات ہے کہ اس کا بہت سا حصہ مٹی کی اینٹوں سے جن کو دھوپ میں پکایا گیا تھا بنا تھا۔

ہلالِ خصیب کا فنِ تعمیر ایک خصوصیت رکھتا ہے۔ اور وہ یہ کہ موصل سے اگر بغداد کی طرف بڑھتے جائیے اور بغداد سے اُر کی جانب جو بصرہ کے قریب ہے تو عمارات مٹی کی اینٹوں سے بنی ہوئی ملیں گی بعض بھٹوں میں پکی ہوئی اور بعض دھوپ میں۔ لیکن موصل کے گرد و نواح میں تمام عمارات پتھر سے بنی ہوئی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ موصل کے گرد و نواح میں پتھروں کی بہت سی کانیں ہیں اور یہاں سے پتھر بہت آسانی سے لے جایا جا سکتا ہے۔ موصل سے بغداد کی طرف پتھر ناپید ہے۔ اور یہی وجہ پتھر کے استعمال کی ہے ہلالِ خصیب کے شمال اور شمال مغرب میں لیکن نہ معلوم خورس آباد میں پتھر کو کثرت سے کیوں استعمال نہیں کیا گیا۔ پتھر کا استعمال غالباً صرف بت تراشنے ہی میں کیا گیا یا کتبات لکھنے میں۔ سارگون دوئم کا ایک کتبہ جو خطِ میخی میں لکھا تھا، ہمیں بھی وہاں ملا۔ یہ بھی لاہور کے عجائب گھر میں اس وقت ہے۔

الغرض آرین، ایران سے ہوتے ہوئے اناطولیا میں پہنچے اور وہاں سے آشور (ASSYRIA) ہوتے ہوئے آکاد اور آکاد سے سومیر پہنچے۔ یہ آرین کے اولین گروہ تھے۔

جو سومر میں پہنچتے ہی سومیری کہلائے۔ ان کے بعد جو جو گروہ ان علاقوں میں آکر آباد ہوتے رہے یا تو اپنے اعتقادات کی وجہ سے مشہور رہوئے یا اپنے ملک کے نام پر پکارے گئے۔

عیلامی (ELAMITES -) یہ لفظ ہمیں سب سے پہلے خورس آبادہی کے کتبوں میں ملتا ہے۔ اس کے معنی ہیں۔ "پہاڑی" یعنی (MOUNTAINOUS) یہ اس علاقے کا نام تھا جو آج کل وسطِ ایران کی سطحِ مرتفع سے بنتا ہے۔ اس مملکت کا دارالسلطنت شوش (SUSA -) تھا۔ عیلامی قوم کا گروہ بھی ایک آرین ہی گروہ تھا۔ اور اس نے ایک قلیل عرصہ تک حکومت کی جو بابل کے تیسرے خاندان کے ہم عصر تھی۔ بابلیوں نے اس ملک پر بہت دھاوے بولے اور بالآخر اسے فتح بھی کرلیا۔ عیلامیوں نے اپنا ایک علیحدہ رسم الخط بھی ایجاد کر رکھا تھا۔ اور ان کی زبان علیحدہ تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے ارض القرآن میں اس سے متعلق تحریر کرتے ہوئے غلط بیانی سے کام لیا ہے، موصوف ج اول ص ۱۳۸ پر فرماتے ہیں" پھر ایک زمانے کے بعد سومیری کتبات کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ جس کا خاتمہ ایک اور تورانی النسل زبان عیلام پر ہوتا ہے۔" ہماری تحقیق کے مطابق عیلامی زبان اور رسم الخط بالکل مختلف تھا سومیری النسل اقوام سے۔ چنانچہ وہ زبان جس رسم الخط میں کتبات پر لکھی گئی اس کا مطلقاً کوئی تعلق سومیری یا تورانی زبانوں سے نہیں۔

اس قوم کا ذکر انجیل میں اکثر مقامات پر ملتا ہے۔ عیلام کی مملکت کو مکمل طور پر حمورابی (HAMMURABI) نے ۲۱۲۳ء قبل مسیح میں فتح کرلیا تھا۔ یہ ایک سومیری شاہنشاہ تھا، جو اپنے مذہبی قوانین یا شریعت کی وجہ سے بہت مشہور ہوگیا تھا۔ درحقیقت اس کی شخصیت کے متعلق بھی بہت سے شکوک موجود ہیں۔ اگرچہ اس کے ثابت ہوجانے کے بعد بھی ہمارے نزدیک کچھ تاریخی علم میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ ہم اگلے صفحوں میں حمورابی کا حال کچھ تفصیل سے لکھیں گے۔ اس وقت اس علاقہ عیلام پر ذرا اور نظر دوڑا لینی چاہیئے۔ آج کل اس کے شمال میں کوہستان زاگرس (ZAGORAS -) ہے۔ ان پہاڑی سلسلوں پر

ایک اور قوم بھی آباد تھی جس کا نام ہم نے فہرست میں درج نہیں کیا۔ ان کو کاشی (KASSI-TES۔) کہا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ قوم مادا یعنی میڈیا کی رہنے والی تھی، اور آرین النسل تھے اس علاقہ میڈیا (MEDIA) یعنی مادا کو پرس رام (PARSU RAMA) روایت میں مدھ دیس کہا گیا ہے یعنی (MADHYADESA۔) یہی مادھ دیس قدیم ایرانی اور آشوری کتبات میں مادا کے نام سے موسوم ہے۔ چنانچہ خط میخی کے کتبوں میں بھی یہی نام ملا ہے۔ اس کو یونانیوں نے میڈیا بنا دیا۔ درحقیقت اصل لفظ قدیم تاریخ میں مدھ دیس ہی تھا جس سے مادا بنا اور پھر میڈیا۔ یہی علاقہ آج کل کا کردستان ہے اور ہماری نگاہ میں کردستان۔ کورو استھان کا بگڑا ہوا ہے اور یہ بھی میڈیا میں شامل تھا۔ چنانچہ یہ جو کرد ہیں آج کل یہی مہابھارت کے کورو (KURUS) ہیں۔ مسٹر ویڈل (L۔D۔ WADDELL۔) اس علاقے کو کورلینڈ (KURLAND) بھی کہتے ہیں اور ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ آرین جو اول ہندوستان پہنچے وہ عیلام کے علاقے سے ہی گئے تھے۔ ہمیں اس سے شدید اختلاف ہے اور ہم اس کی وجہ پچھلے باب میں بیان کر آئے ہیں۔

چنانچہ یہی قوم کاشی (KASSITES) جب ہندوستان پہنچی تو یہ کھتری (KASHATRAYA) کہلائی۔ اب ان اقوام کا ایک مختصر سا چارٹ ملاحظہ کر لیجئے تاکہ تفصیل اور صاف ہو جائے۔

(نقشہ صفحہ ۶۸ پر ملاحظہ فرمائیے)

Marfat.com

آرین اقوام کا نقشہ

سنہ ۶۰۰۰ قبل مسیح سے مختلف گروہ قطب شمالی سے ایران کی طرف آنا شروع ہوئے اور سنہ ۱۵۰۰ قبل مسیح تک یہ آتے رہے ان کے نام یہ ہیں :-

ELAMITES.	KASSITES.	SUMMERIANS	MITANNIS	HITTITES
عیلامی	کاشی	سومیری	میتانی	حتی
ان کی سلطنت بابل میں سنہ ۱۱۰۰ قبل مسیح کے قریب ختم ہوگئی تھی۔ اور کھتری کہلائے۔	ہندوستان میں پہلی مرتبہ سنہ ۷۰۰۰ قبل مسیح میں داخل ہوئے	میتانی جب سومر میں پہنچے تو سومیری بھی کہلائے۔ سارگون اعظم کے عہد میں یہ ہندوستان داخل ہوئے اس کا لڑکا MENES مینز۔ مصر پر قابض تھا اور اس نے اپنے آپکو پارو کہلانا شروع کر دیا تھا جس کا مطلب تھا فرعون!	ایشیائے کوچک میں مقیم تھے۔ مگر بابل کی طرف ہجرت کر گئے یہ مادا کے لوگوں کے ساتھ ہندوستان میں تقریباً سنہ ۱۰۰۰ قبل مسیح میں پہنچے۔	اناطولیا سے ASIA MINOR آکاد اور سومر کو عبور کر کے ہندوستان پہنچے۔ یہ زمانہ تقریباً سنہ ۱۷۰۰ قبل مسیح کا تھا

Marfat.com

سر پرسی سائیکس (SIR PERCY SYKES) اپنی کتاب HISTORY - OF PERSIA VOL I میں لکھتے ہیں کہ میڈیا کے لوگ جب اول اول ایران پہنچے تو یہ جنوبی روس کی طرف سے آئے تھے، اور ان کی آمد و رفت کے وقت ارارات ARA - RAT میں ایک حکومت موجود تھی۔ جنکا رعب ان پر اسقدر جما کہ یہ بغیر مڈبھیڑ کئے وسطِ ایران کو بڑھ آئے۔ مگر ہمیں اس زمانے کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس وقت آرین کا ایک اور گروہ مشرقی ایران کی طرف بھی بڑھ رہا تھا اور یہ گروہ خراسان کی طرف سے داخل ہوا تھا۔ اس نے اول کرمان کو فتح کیا اور فارس تک پہنچا، اس وقت دادی زندہ رُود میڈین اقوام کے قبضے میں تھی اور اس کا تسلط خلیج فارس تک تھا۔ اس نقل و حرکت کا زمانہ ہماری دانست میں سنہ ۲۵۰۰ قبل مسیح ہے۔ مگر ڈی مارگن (DE MORGON) فرماتے ہیں کہ جب یہ نقل و حرکت شروع ہوئی تو وہ زمانہ تقریباً سنہ ۲۰۰۰ قبل مسیح کا تھا۔ بہر حال ان کا زمانہ خواہ کچھ ہی ہو، یہ آرین کے اولین گروہوں سے بہت بعد میں آئے۔

ابھی ہم نے سطورِ بالا میں وینڈل صاحب کے کور لینڈ کا ذکر کیا تھا۔ سومیری زبان میں بھی ایک لفظ اس کے مشابہ ملتا ہے جس کو کُور (KUR) کہتے ہیں اور جس کے معانی بھی وہی ہیں یعنی "پہاڑی" (MOUNTAINOUS) جو ہم نے عیلام کے بتائے تھے۔ سومیری اس کو مشرقی مادا کے لئے استعمال کرتے تھے۔ عبرانی زبان میں بھی اس قسم کا ایک لفظ موجود ہے جس کا تلفظ ہے کور (KORE) اس کے معنی ہیں۔ "حفاظت کرنے والا" یا - ONE WHO DEFE - NDS A PLACE درحقیقت عبرانی میں کور کہتے ہیں جگہ کو (PLACE) اس تمام بحث کا اب لب لباب یہ نکلا کہ مادا۔ میڈیا۔ مدہ دیس۔ کور لینڈ۔ کور و استعمان اور آج کل کا کردستان تقریباً تقریباً ایک ہی علاقہ کا نام ہے جو مختلف وقتوں اور حکومتوں کے زیر اثر بدلتا رہا۔ . .

مادی یا میڈین یہ لوگ میڈیا کے باشندے تھے۔ میڈیا جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے۔ یونانی اختراع ہے

مادا کے لئے عرب مورخوں نے اسے ماہات کہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن ج دوم ص ۴۰۲ پر فرماتے ہیں:۔

"حضرت مسیح سے پانچسو ساٹھ برس پہلے ایران کی سرزمین دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی جنوبی حصہ پارس کہلاتا تھا اور شمال مغربی میڈیا۔ چونکہ ان کے ہمسایہ میں بابلی اور آشوری حکومتیں انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھیں اس لئے قدرتی طور پر یہ ان سے دبی ہوئی تھیں۔ دونوں مملکتوں میں مختلف قبائل کے امراء تھے جو اپنے اپنے حلقوں میں قبائلی حکومت رکھتے تھے۔ ۶۱۲ قبل مسیح میں جب نینوا تباہ ہوگیا اور آشوری فرمانروائی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی تو میڈیا کے باشندے آزاد ہوگئے اور بتدریج ایک قومی حکومت نشو ونما پانے لگی"۔

مندرجہ بالا بیان اس وقت کا ہے جب میڈیا کی تہذیب ابھر رہی تھی۔ اس زمانے سے پیشتر بھی اس علاقے میں اقوام موجود تھیں مگر وہاں کوئی نمایاں تہذیب نشو ونما نہ پا رہی تھی۔ اگر اس علاقہ کو محض ایک اردک یعنی (CAMPING GROUND) کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ تقریباً تمام آرین گروہ یہاں ہی سے ہوتے ہوئے مشرق وسطیٰ اور ہندوستان میں پہنچے مگر اس علاقے میں ان کا مستقل قیام ہرگز نہیں ہوا۔ تاوقتیکہ ذوالقرنین نے اس کو فتح کرکے ایک مستقل حکومت نہ قائم کرلی۔

صوبیری SUBEREANS ان کے متعلق ہم بہت کم جانتے ہیں انکا تذکرہ صرف اسوریہ سے کررہے ہیں کہ ان کا تعلق یتانیوں کے ساتھ ہے۔ مورخین کہتے ہیں کہ یتانیوں ہی کے کچھ گروہ بعد میں صوبیری کہلانے لگ گئے تھے۔ درحقیقت یتانیوں اور حوری کے درمیان صوبیری درجہ ہے یعنی حوری کہلانے سے پیشتر یتانی غالباً صوبیری کہلایا کرتے تھے۔ ماہرین آثریات نے ایک قدیم زبان کا بھی پتہ لگایا ہے جو یتانی زبان سے مختلف ہے اور اس کا نام انھوں نے صوبیری زبان رکھدیا ہے۔

اوپر ہم نے کچھ اقوام کا ذکر کردیا ہے جو اولین گروہ آرین سے پیدا ہوئیں اور جنہوں نے

مختلف وقتوں میں مختلف جگھوں پر اپنی اپنی ایک مخصوص تہذیب کی بنیاد رکھی۔ اب بہتر معلوم ہوتا ہے کہ چند..... اور مقامات کا بھی ذکر کر دیا جائے جنکی جستہ جستہ تفصیل ہم گذشتہ ابواب میں کر آئے ہیں۔ جو بات غور طلب ہے وہ فقط اتنی ہے کہ جس ترتیب سے ہم نے مذکورۂ بالا فہرستِ اقوام بنائی ہے اس کو کیا اسی طرح رہنے دیا جائے یا اس میں ردّ و بدل کرنا مناسب ہوگا؟

جو بات ترمیم کے قابل ہے وہ صرف اتنی ہے کہ یہ سب اقوام ایک ہی نسل سے تھیں اور مختلف وقتوں میں مختلف جانب میں حرکت کرتی رہیں اور جہاں جوں ترقی کرتی گئیں ایک بہتر تہذیب کی بنیاد رکھتی گئیں۔ یہ بات کہ ان کے ہلالِ خصیب میں وارد ہونے سے پہلے یہاں کے باشندے کون تھے۔ تو اس میں چنداں اشکال نہیں؟ آرین کے قطب شمالی سے چلے آنے کے بعد یا وسطِ ایشیا سے حرکت کرنے کے بعد پھر وہاں کون موجود تھا؟ بات صرف اتنی ہے کہ اگر ہم اقوام کی نقل و حرکت کے ساتھ ساتھ موسموں کا تغیر و تبدل بھی زیرِ نگاہ رکھیں تو پھر اس مسئلہ میں کوئی پیچیدگی معلوم نہیں ہوتی۔ یہ حالت دنیا کے ہر خطہ میں رہی ہے تاوقتیکہ وہ خطہ قابل رہائش نہ ہو گیا ہو۔ دنیا میں اب بھی بے شمار ایسے حصے ہیں جہاں کوئی آباد نہیں! تو پھر ہلالِ خصیب کے متعلق کیوں یہ تعجب ہو۔ اسی طرح ہلالِ خصیب جب آہستہ آہستہ بیابان بننے لگا تو یہ گروہ ایک ایک کر کے مختلف ممالک میں ہجرت کرنے لگے۔ چنانچہ ہندوستان اور مصر بھی پہنچے۔ کچھ گروہ ان کے ہلالِ خصیب میں آنے سے پیشتر ہی روس سے ہوتے ہوئے یورپ میں پہنچ چکے تھے۔ آج کل ان ممالک میں کچھ بھی نہیں رکھا جہاں کبھی دنیا کی سب سے زبردست تہذیبیں موجود تھیں۔ بغداد اور مصیب کو عراقی لوگوں نے بابل کی اینٹوں سے تعمیر کیا۔ آشور اور نمرود اور نینوا کی اینٹیں موصل کو تعمیر کرنے میں استعمال ہوئیں۔ آج تک موصل کے بازاروں میں سناچرب (SENNACHERIB) کے محل کی محرابیں لگی نظر آتی ہیں! غرضیکہ یہ تمام علاقے قابل رہائش رہے۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ اس کی خواہ کچھ ہی وجوہات بیان کرتے ہوں، ہم تو لکھ چکے ہیں کہ اسکی وجہ محض قہرِ الٰہی تھا جس نے ان آبادیوں کو تباہ و برباد کر دیا۔

Marfat.com

وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝

اور یہ جو موسموں کا تغیر ہے تو یہ ایک قدرتی امر ہے جس کا تعلق قہر الٰہی سے مطلقاً نہیں ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے کہ موسموں میں تغیر و تبدل ہوتے رہے۔ بابل کی تاریخ میں ایک زمانہ وہ بھی تھا جبکہ ملکہ سمیرامیز (SEMIRAMES -) نے الجنائن المعلقہ (HANGING GARDENS) بنوائے تھے، اور تصور کیا جاتا ہے کہ طاقِ قصریٰ (ARCH OF CTESIPHON) بھی اس نے ہی بنوایا تھا اور خسرو کا طاق قصریٰ سے کچھ تعلق نہ تھا جیسا کہ بعض مورخین کہتے ہیں۔ اور اب دیکھئے کہ وہاں سوائے ریت اور کھجوروں کے درختوں کے کوسوں تک کچھ نظر نہیں آتا! موہنجو دارو اور ہڑپا کی تہذیبیں جہاں موجود تھیں وہ علاقے بھی ریگستان بن چکے ہیں اور رہائش کے قابل نہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالےٰ قوموں کے دن پھیرتا رہتا ہے اسی طرح موسموں اور مقامات کے حالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔

وڈل صاحب اپنی تصنیف میں، جس کا ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دیگر اقوام کی نقل و حرکت کے ساتھ ختّی جب ہندوستان پہنچے تو وہ وادیٔ گنگا میں سیدھے وارد ہوئے۔ ختّی اس وقت خِتّی بھی کہلاتے تھے۔ یہ ہندوستان میں آکر کھتری بن گئے۔ مگر ہم کہہ چکے ہیں کہ کھتری (KASHATRAYA -) جو کہلائے وہ کاشی تھے (KASSITES) وڈل صاحب جس زمانے کا ذکر کرتے ہیں وہ ۷۰۰ قبل مسیح کا زمانہ ہے ہمیں اس تحقیق سے اتفاق نہیں کاشی گروہ جب ہندوستان میں آکر کھتری کہلایا تو یہ وقت ۱۲۰۰ قبل مسیح کا تھا ان کی آمد سے بہت پہلے آرین تہذیب ہندوستان پہنچ چکی تھی۔ اور ہندوؤں میں جو مختلف ذاتیں اس وقت موجود ہیں یہ تمام ہندوستان ہی میں آکر بنیں اگرچہ ہمیں حمورابی کی شریعت میں بھی یہ بات نظر آتی ہے کہ اس زمانے میں بھی ڈو درجے انھوں نے انسانوں کے کر رکھے تھے۔ مگر یہ نام جو انھوں نے پائے

تو یہ ہندوستان آکر ہی انکو دیئے گئے۔ حمورابی کے زمانے میں جو دو درجے پائے جاتے تھے تو انمیں میں ایک سپاہی پیشہ تھے اور دوسرے تجارتی۔ مگر انھیں کسی خاص نام سے منسوب نہیں کیا گیا تھا۔ برہمن کا تخیل تمامتر ہندی ہے۔ زیادہ اس لئے کہ اس کا تعلق ہندوؤں کی تثلیث کے ساتھ ہے برہما (BRAHMA) تثلیث (TRINITY) کا ایک جزو ہے اور یہ برہمن اسی برہما کی اولاد کہلائے جاتے ہیں۔

مختصر طور پر انکی تاریخ یوں ہے۔ برہما کے سر سے سات رشی پیدا ہوئے (ان سات رشیوں میں سے دو کھتری تھے!) بہرحال ان دو کو جنیو پہنا کر برہمن کیا گیا!! انہی سات رشیوں کی اولاد کو برہمن کہا جاتا ہے۔ ان رشیوں کے مرجانے کے بعد یہ مشہور کر دیا گیا کہ یہ آسمانوں پر چلے گئے ہیں اور یہ جو سات ستارے ہم دیکھتے ہیں جن کو انگریزی میں GREAT BEAR کہا جاتا ہے اور جس کی مدد سے قطبی ستارے کی سمت دریافت کی جاتی ہے، وہی سات رشی ہیں جو برہما سے پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش غالباً برہما کے سر سے اس لئے کہی جاتی ہے کیونکہ سر انسان کا ایک بزرگ تر حصہ ہے!

اس باب میں ہم نے حمورابی کا دو تین بار ذکر کیا ہے۔ چونکہ اس کی شخصیت بہت اہم ہے۔ سو میری بادشاہوں میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے متعلق اپنی تحقیق بیان کر دی جائے۔ اس کا زمانہ تقریباً ۲۱۲۳ قبل مسیح تھا۔ ہم اس کا شجرۂ نسب جس طرح خط میخی کے کتبات سے حل ہوا ہے ذیل میں درج کرتے ہیں کیونکہ یہ سلسلۂ ملوک تاریخِ قدیم میں بہت نمایاں ہے۔ اس ضمن میں ہماری نگاہ سے وہ بھی شجرۂ نسب گذرا ہے جو مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے ارض قرآن ج اول ص ۱۴۳ پر دیا ہے۔ یہ شجرہ جدید تحقیق کے مطابق غلط ہے۔ ہم دونوں کو صفحہ ۷۴ پر درج کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام خود مقابلہ کر سکیں۔

شجرہ صفحہ ۷۴ پر ملاحظہ کیجئے :—

Marfat.com

جدید تحقیق کے مطابق شجرۂ ملوک

نمبر شمار	نام بادشاہ	قبل ـــــ زمانہ	ـــــ مسیح	عرصۂ حکومت
۱	سمو۔ الیوم	۲۲۲۵ سے لے کر	۲۲۱۲ تک	۱۴ سال
۲	سمولا۔ ایلم	۲۲۱۱ // //	۲۱۷۶ //	۳۶ //
۳	زابوم	۲۱۷۵	۲۱۶۲ //	۱۴ //
۴	اپل سن	۲۱۶۱ // //	۲۱۴۴ //	۱۸ //
۵	سن مبلط	۲۱۴۳ // //	۲۱۲۴ //	۲۰ //
۶	حمورابی	۲۱۲۳ // //	۲۰۸۱ //	۴۳ //
۷	سمسو۔ ایلونا	۲۰۸۰ // //	۲۰۴۳ //	۳۸ //
۸	ابی۔ ایشوع	۲۰۴۲ // //	۲۰۱۵ //	۲۸ //
۹	عمّی دِتانا	۲۰۱۴ // //	۱۹۷۸ //	۳۷ //
۱۰	عمّی ذادقہ	۱۹۷۷	۱۹۵۷ //	۲۱ //
۱۱	سمسو دِتانا	۱۹۵۶ // //	۱۹۱۴ //	۲۱ //

ارض القرآن کا پیش کردہ شجرۂ ملوک

نمبر شمار	نام بادشاہ	قبل ـــــ زمانہ	ـــــ مسیح	عرصۂ حکومت
۱	سمو۔ آبی	۲۴۵۴ سے لے کر	۲۴۴۰ تک	۱۵ سال
۲	سمولا۔ ایلو	۲۴۳۹ // //	۲۳۹۱ //	۳۵ //
۳	ذابیم	۲۴۰۴ // //	۲۳۹۱	۱۴ //
۴	اپل سن	۲۳۹۰ // //	۲۳۷۳ //	۱۸ //
۵	سن۔ مبلط	۲۳۷۲ // //	۲۳۴۳ //	۳۰ //

Marfat.com

۶	حمورابی	۲۳۴۲ سے لے کر	۲۲۸۸ تک	۵۵ سال
۷	سمو - ایلونا	۲۲۸۷ // //	۲۲۳۵ //	۳۵ //
۸	ابی لیشوع	۲۲۵۲ // //	۲۲۲۸ //	۲۵ //
۹	عمی - ستانا	۲۲۲۷ // //	۲۲۰۳ //	۲۵ //
۱۰	عمی - صادقا	۲۲۰۲ // //	۲۱۸۲ //	۲۱ //
۱۱	سمو - ستانا	۲۱۱۸ // //	۲۱۵۱ //	۳۱ //

جدید تحقیق کے مطابق ہم نے جو شجرۂ ملوک پیش کیا ہے۔ اس کے لئے قارئینِ کرام کی توجہ کنگ (L.W. KING) کی مشہور و مستند کتاب HISTORY OF BABYLON (تاریخ بابل) کی طرف مبذول کرواتے ہیں۔ موصوف نے یہ شجرہ ص ۳۱۹ پر پیش کیا ہے۔ بادشاہوں کے ناموں میں قدرے اختلاف واقع ہو گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ چنداں اہم نہیں ہے کتبات میخی کو حل کرتے وقت اکثر یہ نقل واقع ہو جاتی ہے۔ اس کی تفصیل ہم اگلے باب میں ان شاء اللہ تعالٰے کریں گے۔

چنانچہ حمورابی (HAMMURABI.) نے ۴۳ سال حکومت کی۔ اور اپنے قوانین بنائے ان قوانین کو شریعتِ حمورابی (THE GODE OF HAMMURABI.) بھی کہا جاتا ہے اور یہ دنیا کے بڑے قوانین میں تصور کی جاتی ہے۔ اس نے اس شریعت کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب کیا۔ یہ بات ہمیں ان قوانین کے دیباچہ سے معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت اس نے آشور اور نینوا کو بھی ختم کر لیا تھا۔ اور یہ شہر اس کے چالیسویں سال حکومت میں فتح ہوئے۔ ان قوانین کا اب ترجمہ ہو چکا ہے۔ بعض مستشرقین کہتے ہیں کہ تورات انہی قوانین کی نقل ہے! حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ حمورابی سے تقریباً پانچ سو سال بعد پیدا ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو ان قوانین کا علم ہو۔ مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ انھوں نے انہی قوانین کو نقل کیا؟

Marfat.com

وحی الٰہی پے در پے مختلف مقامات پر آتی رہی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ حمورابی کے کان تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صدا بھی پہنچی ہو؟ اور اس نے ان کے ہی ارشادات کو قلمبند کر دیا ہو! یہ بھی ممکن ہے کہ حمورابی چونکہ خود ایک بہت پارسا اور عبادت گذار بادشاہ تھا اور اس کی سلطنت میں بہت امن و امان رہا۔ یہ خود بھی کوئی نبی ہو۔ جس کے متعلق تاریخ اور آسمانی صحائف خاموش ہیں۔ کیا یہ بعید از عقل ہے کہ اس پر وحی کے ذریعہ قوانین اترے ہوں اور اس نے خط میخی میں لکھوا کر انھیں محفوظ کر لیا ہو؟ تمام آسمانی صحائف میں مشابہت اور مماثلت ہے۔ مگر اس سے یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب ایک دوسرے کی نقل ہیں؟ البتہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ تمام صحیفے مختلف پیغمبروں پر وحی کے ذریعے نازل ہوتے رہے اور اس میں کسی کو بھی شک کی گنجائش نہیں۔

حمورابی کے قوانین میں سپاہی اور تجارتی کے علاوہ آزاد اور غلام کی بھی تقسیم موجود ہے ہمارے نزدیک یہ ایک معاشرتی تقسیم ہوگی۔ اور یہ تقسیم چند ایک قدیم عبرانی قوانین میں بھی پائی جاتی ہے۔ حمورابی کے قوانین میں اللہ تعالےٰ کے لئے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ مہرالی (MAHAR – ILI) ہے۔ دراصل اس کے معانی "اللہ کے روبرو" (BEF-OREGOD) ہیں۔ الی (ILI) کے معانی اللہ کے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے نام کا یہ حرف (لا) زمانہ قدیم سے ہی ایسے چلا آتا ہے۔ بابل کی وجہ تسمیہ لاہور کے ذکر میں ہم ثابت کر آئے ہیں کہ اس کا مطلب اللہ ہی ہے۔ حمورابی کے قوانین میں یہ لفظ ان معنوں میں استعمال کیا گیا ہے کہ جب انسان مر کر دوسری دنیا میں چلا جائے گا تو وہ اپنے اعمال کئے لئے "اللہ کے روبرو" پیش ہوگا گویا کہ حیات بعد الموت کا تخیل بھی ان لوگوں میں موجود تھا۔ اور یہ وحی الٰہی کا ایک اہم جزو ہے۔ اس سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ حمورابی کو ایک "رب العالمین" کا احساس تھا۔ اور پھر کیا یہ احساس و یقین کوئی معمولی احساس ہے؟

حمورابی کے قوانین بہت مفصل ہیں۔ ان میں ہر قسم کی بحث موجود ہے اور جو قوانین

یک سوسائٹی کے لئے مناسب وموزوں ہیں اس زمانے کے مطابق سب بتادئے ہیں۔

حمورابی کے مختلف نام مشہور رہیں۔ اس کی شخصیت کے متعلق بھی اختلاف ہے جیساکہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ مگر چونکہ یہ ایک مختلف فیہ موضوع ہے اس لئے اسے نظر انداز کردیا جاتا ہے البتہ اس کے ناموں میں جو اختلاف ہے اس سے متعلق ہم اپنی تحقیق بیان کرنا چاہتے ہیں۔

جیساکہ ہم نے ابھی عرض کیا ہے حمورابی مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی نام بھی درست نہیں۔ ہمیں اس کے معانی سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ لہٰذا جو صحیح نام ہم نے تجویز کیا ہے اس کی تفصیل ذیل میں اختصاراً عرض ہے۔ ہم نے بہت سے خط میخی کے کتبوں سے اس نام کا حل دیکھا ہے۔ کسی ایک میں بھی یگانگت موجود نہیں۔ حروف والفاظ وتلفظ میں اگرچہ تطابق ہے، مگر ان کے معانی کچھ نہیں نکلتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نام نہ تو حمورابی ہے اور نہ ہی خمورابی۔ ہماری تحقیق کے مطابق اصل نام حمیرابو ہے۔ حمیر حمرۃ (سرخی) سے ماخوذ ہے اور احمر سرخ کو کہتے ہیں۔ ابو عربی میں والد کو کہتے ہیں۔ تو گویا حمیرابو (HAMIR ABU) کے معنی ہوگئے۔ سرخ والد یعنی (THE RED FATHER .) ممکن ہے کہ یہ بطور محاورہ ہی استعمال ہوا ہو کیونکہ اس کا رنگ سرخ وسفید ہوگا۔ چنانچہ حمیر محض اس کی رنگت کے لئے مستعمل معلوم ہوتا ہے اور ابو اس کو اس لئے کہتے ہوں کہ یہ اپنی قوم کو نہایت درجہ عدل و انصاف کے ساتھ رکھتا ہو۔ مصطفےٰ کمال پاشا کو اس کی قوم نے کمال اتاترک کا لقب دیا یعنی ترکوں کا باپ" حمیرابو بھی ممکن ہے کوئی اس قسم کا لقب ہو۔ ہماری اس تحقیق پر پہنچنے کی اور ایک وجہ بھی ہے۔ کہ جب ہم نے اپنے علم کے مطابق خط میخی سے حمورابی کا حل کرنا شروع کیا۔ تو بجائے حمورابی کے ہر دفعہ حمی رابو ہی بنتا تھا یعنی (HAMIRABBU .) پہلے کچھ مغالطہ کا خیال ہوا مگر جب بار بار یہی حل نکلتا رہا تو یقین ہوگیا کہ ماہرین اثریات نے اس بادشاہ کا نام غلط حل کیا ہے مگر اس میں ایک پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ اور وہ یہ کہ ایک دفعہ ایسے ہی خط میخی کے کتبات کا حل کرتے کرتے ایک لفظ پر پہنچا جو رَبُّو (RABBU .) تھا، اور جن معنوں میں

Marfat.com

یہ مستعمل تھا وہ بعینہٖ لفظ ربّ کے ہم معنیٰ تھا۔ تو پھر جب ہم نے اس نام کو دو حصوں میں تقسیم کیا تو وہ (HAMI RABBU) حمی رَبُّو بن گیا۔ رَبُّو کے معنیٰ تو سمجھ میں آگئے مگر پہلے حصّے کے یعنی HAMI کے معنیٰ معلوم نہ ہو سکے۔

ممکن ہے کہ ہمارے حل میں بھی کچھ غلطی رہ گئی ہو۔ لیکن ایک مرتبہ پھر جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ حمی رَبُّو نہیں بلکہ حمیر ابو ہے یعنی (HAMIR ABBU) ہم نے غلطی سے R کو A کے ساتھ ملا دیا تھا۔ چنانچہ اصل نام جو نکلا وہ حمیر ابو (HAMIR ABBU) تھا۔ دراصل خط میخی کے کتبوں کے حل کے تمام اصول کسی قاعدہ کے مطابق نہیں ہیں۔ ماہرین جس طرح چاہتے ہیں ان کو توڑ مروڑ کر سیدھا کر لیتے ہیں۔ اور چونکہ کچھ نام ان کو پیشتر ہی سے معلوم ہوتے ہیں، یہ اتنی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان کی تہ تک پہنچا جائے۔ اس عمل کے لئے ایک تو بہت وقت درکار ہے دوسرے خط میخی کے لغت کی کمی کی وجہ سے اس میں اور بھی بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر حمورابی کا نام ہماری تحقیق کے مطابق حمیر ابو مان لیا جائے تو اس کے معانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ ہم یہ بات بھی تصور کر سکتے ہیں کہ صفاتِ الٰہی کا مکمل احساس نہ ہونے کی وجہ سے بجائے ابو کے ربو کا لفظ استعمال کر دیا ہو۔ اس وجہ سے ہم نے R کو بجائے A کے ساتھ شامل کرنے کے "I" کے ساتھ چسپاں کر دیا ہے۔ اور آخر حصّہ کو ابو بنا دیا ہے اور پہلے حصّے کو حمیر! گویا ہماری تحقیق کے مطابق یہ نام حمیر ابو (HAMIR ABBU) ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب

تاریخ قدیم کے متعلق بہت کچھ ماہرین نے لکھ دیا ہے۔ مگر اس تمام عرصہ کی سرگذشت کو ابھی نئے سرے سے درست کرنا باقی ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ جس دن ان تمام تحقیقات کا نئے سرے سے حل ہو گیا تو دنیا کے بہت سے مسائل کی پیچیدگیاں رفع ہو جائیں گی۔

Marfat.com

باب سوئم

علم نقلِ الکلمہ[1]

قدیم تاریخ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرف واضح ہو جائے گی کہ متعدد نام اور اصطلاحات مختلف زمانوں میں مختلف زبانوں کے اندر کچھ تھوڑے اختلاف کے بعد اختیار کر لئے جاتے ہیں۔ ان اصطلاحات کی ترکیب کے وقت انکی شکل و شباہت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور بڑی خوش اسلوبی سے ان کو جذب کر لیا جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ تھوڑے سے ردّ و بدل کے بعد وہ اصطلاحات دوسری زبان میں بالکل منتقل کر لئے جاتے ہیں۔ اور کبھی کافی سے زیادہ تبدیلی بھی واقع ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات غیر شعوری طور پر بھی یہ عمل سرزد ہو جاتا ہے۔ نقل کی یہ صورت دو طرح کی ہوتی ہے۔

ایک یہ کہ جب ایک قوم تہذیب و تمدن کا پرچم لے کر ابھرتی ہے تو وہ اپنے زمانے کے علوم کو نہ

---

[1] ہمیں یہی اصطلاح موزوں معلوم ہوئی ہے۔ جب میٹاتھیسس (METATHESIS) کے لئے مناسب لفظ نہ ملا تو ہم نے TRANSPOSITION OF WORDS. کا ہی ترجمہ بہتر سمجھا ہے۔

Marfat.com

ہی صرف ترقی دیتی ہے، بلکہ گذشتہ علوم میں بھی اپنی طرف سے اضافہ کرکے انہیں اپنے علوم میں شامل کرلیتی ہے۔ اس سلسلہ میں جو معلومات اس قوم کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں ان کے نام یہ خود تجویز کرکے انہیں اپنے ذخیرۂ لغات میں جمع کرلیتی ہے، لیکن جب یہ تہذیب ختم ہوجاتی ہے تو اس کے بعد آنیوالی تہذیب ان تمام علوم کو دوبارہ جذب کرنا شروع کردیتی ہے۔ زمانہ قدیم سے یہی چلا آیا ہے اور تاریخ اس کی شاہد ہے۔ پھر جو ہم عصر تہذیبیں ہوتی ہیں وہ بھی ایک دوسرے کے علمی شاہکاروں سے مستفید ہوتی رہتی ہیں اور اگر ان دونوں قوموں کی زبانیں مختلف ہوں تو ایک دوسرے کی اصطلاحات جو مناسب حال ہوں ان کو منتقل کرکے اخذ کرلیا جاتا ہے، اور بعض اوقات انکا مناسب ترجمہ بھی کرکے اس کو دوسری زبان میں اختیار کرلیا جاتا ہے۔

جب عرب قوم عروج پر تھی تو انھوں نے تمام گذشتہ اور موجودہ علوم کو جذب کرلیا تھا۔ اور ایک نئی ریسرچ کی روح پیدا کردی تھی۔ ان سے پہلے مصری، ایرانی، بابلی۔ کلدانی اور آشوری تہذیبیں اپنے اپنے وقت میں کمال حاصل کرچکی تھیں لیکن ان کا بھی یہی حال تھا کہ ایک قوم دوسری قوم سے علم حاصل کرتی اور اس کو ترقی دیتی۔ ان تمام تہذیبوں کا باہم اثر بہت نمایاں ہے اور علمی لحاظ سے ان میں بہت کچھ یگانگت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح یونانیوں سے بہت کچھ عربوں نے حاصل کیا یہاں تک کہ ان کی بہت سی علمی اصطلاحات کا ترجمہ کرکے انہیں اپنی لغت میں شامل کرلیا۔ مثلاً یونانی کا SEMILUNER VALVE عربی میں سکر ہلالی بن گیا اور TRICUSPID VALVE سکر ثلاثی ترجمہ کردیا گیا۔

اسی طرح عربوں کے بعد جب موجودہ یورپین تہذیب کا دور دورہ ہوا تو انھوں نے عربوں ہی سے علم حاصل کیا۔ تمام علوم انھوں نے عربی زبان ہی سے سیکھے۔ چنانچہ عربی زبان کے پرمعنی الفاظ کو انھوں نے اپنی زبانوں میں منتقل کیا اور بعض کا ترجمہ کرکے انکو اختیار بھی کرلیا۔ اس طرح فلسفہ لغات کی رو سے جو نقل ہوئی تو یہ تراجم اصطلاحات پر تھے نہ کہ نقل الحروف پر یہ بھی دراصل نقلِ کلمہ کی ایک قسم ہے۔ مثال کے طور پر چند اشارات کئے جاتے ہیں تاکہ بہر بات

Marfat.com

ذہن نشین ہوجائے ۔۔ اگر صاحب ذوق کے لئے یہ ناکافی ہوں تو انھیں اس موضوع پر کسی مستند کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

عربی زبان میں "فُنْدُقَ" ہوٹل کے لئے مستعمل ہے یہی لفظ ہسپانوی زبان میں فونڈا (FONDA) بن گیا۔ اب ذرا ملاحظہ فرمائیے ان دونوں الفاظ میں کسقدر مشابہت ہے اگرچہ دو مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں۔ "پھر تعریف" کا لفظ لیجئے، اس کے معنی عربی زبان میں نوٹس کے ہیں، انگریزی زبان میں یہ لفظ TARRIF کی شکل اختیار کریگا۔ اسی طرح "جبل الطارق" کو GIBRALTER کہہ کر اپنا لیا گیا اور "ارسنل" ARSENAL کہلایا۔ عوام کی نگاہوں سے یہ حقیقتیں پوشیدہ ہیں اس لئے وہ یہی سمجھتے کہ یہ الفاظ جو ہم دوسری زبانوں میں سنتے ہیں یہ خود ان کے ہی ایجاد کردہ ہیں۔ حالانکہ اگر حقیقت کا مشاہدہ کرنا ہو تو انگریزی زبان کی کوئی لغت اٹھا کر دیکھ لیجئے ہر صفحہ پر نظر دوڑائیے۔ دعوے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بمشکل آدھی درجن الفاظ ایسے ملیں گے جو خالص انگریزی زبان کے ہونگے۔ باقی تمام کے سامنے یا تو لاطینی لکھا ہوگا یا یونانی اور عربی! یہ اس تہذیب کا حال ہے جس نے دنیا کی تمام گذشتہ تہذیبوں کو نچوڑ کر انکا عرق نکال لیا ہے۔ اس قسم کی اور بھی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر اختصار کو مدنظر رکھ کر اختراز کیا جاتا ہے شائقین کے لئے مختصر طور پر اس کی تفصیل LEGASY OF ISLAM (مطبوعہ آکسفورڈ) میں مل جائے گی۔

بعض زبانوں میں الفاظ کا تلفظ بھی بدل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک زبان سے کوئی لفظ اخذ کیا جاتا ہے تو اس کی آواز قائم رکھنے کے لئے دوسری زبان کے کسی مشابہ حرف کا تلفظ ویسا ہی بنا لیا جاتا ہے، جو اصل لفظ کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ مثلاً ہسپانوی زبان میں حرف "ایکس" (X) کا تلفظ سترھویں صدی عیسوی تک حرف "ش" (SH) کی طرح تھا

نقل الکلمہ کی دوسری قسم میں الفاظ کے اندر حروف کی ترکیب بالکل بدل جاتی ہے، مگر اکثر حروف وہی رہتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان

Marfat.com

میں منتقل ہوتا ہے، تو ممکن ہے یہ دوسری زبان بولنے والی قوم اس کا تلفظ بہ آسانی اس طرح ادا نہ کرسکے، لہٰذا وہ اس کو اس طرح منتقل کرتی ہے کہ اس کے حروف تو وہی رہتے ہیں مگر ان کی ترکیب یا پوزیشن بدل کر اس کے تلفظ میں سہولت پیدا کر دیتی ہے۔ پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے کچھ حروف اڑا دیئے جاتے ہیں اور اس طرح پڑھنے کے لئے آسانی پیدا کرلی جاتی ہے

اسی جنگ کے دوران میں ہمارے ملک میں بہت سی اقوام کا ورود ہوا۔ ان میں اکثریت انگریزی بولنے والوں کی تھی، ان میں بہت سے لوگوں کو ہمارے ہندوستانی کے الفاظ پسند آئے شاید اس لئے کہ ان میں وضاحت زیادہ ہے۔ مثلاً "بندوبست" "جلدی" "ٹھیک" "چلو" وغیرہم شاید ہی کوئی امریکن یا انگریز ایسا ہوگا جس کی زبان پر یہ الفاظ نہ رہتے ہونگے۔ بعض اوقات ان کو پورا استعمال نہیں کرتے تھے مثلاً "بندوبست" کو صرف "بندو" ہی کہہ کر اکتفا کرتے تھے۔ اسی طرح "ٹھیک" کا تلفظ ذرا مشکل ہے۔ مگر چونکہ یہ بہت پسند تھا اس لئے اس کو "ٹیک" TEEK ہی کہہ لیتے تھے۔ یہ تو ہے ہمارا آج کل کا مشاہدہ جو ہم اپنے الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد بہت سے اردو کے الفاظ انگریزی لغات میں شامل کرلئے گئے تھے۔ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوتا نظر آتا ہے۔ جن حالتوں میں الفاظ و حروف بدل دیئے جاتے ہیں تو انکی بھی یہی وجہ ہوتی ہے کہ یا تو جذب کرنے والی زبان میں وہ حروف ہی نہیں ہوتے اور یا اس قوم کا تلفظ ہی اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ ان الفاظ کو ادا نہیں کرسکتی اور وہ اس میں اپنی زبان کے مناسب حروف کا استعمال کرتی ہے۔ اس نقل میں ایک بات کو مدنظر رکھا جاتا ہے کہ جن علامات یعنی SYLLABLES پر زیادہ زور رہتا ہے ان کو تبدیل نہیں کیا جاتا۔ یعنی لفظ کا ڈھانچہ بعینہٖ وہی رہتا ہے جو اصل زبان میں تھا۔ اب کچھ اس نقل کی تاریخ بھی بیان کردینا ضروری ہے تاکہ آئندہ مثالوں کے سمجھنے میں سہولت پیدا ہوجائے۔

کسی ایک زبان کو لیجئے۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ جب ایک زبان بولنے والے مختلف گروہوں میں

Marfat.com

تقسیم ہو کر مختلف سمتوں میں بکھر جاتے ہیں، تو کچھ عرصہ گذرنے کے بعد ان کے لب و لہجہ میں اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ جب کچھ اور عرصہ گذرتا ہے تو یہ زبان بالکل ہی مختلف نظر آنے لگ جاتی ہے۔ ماہرین فن ضرور اس حقیقت سے آشنا ہوں گے کہ اختلاف محض زمان و مکان ہی کا پیدا کیا ہوا نہیں ہوتا بلکہ اس میں آب و ہوا اور زمین کا بھی دخل ہے۔ جس وقت ایک مقام سے نقل و حرکت شروع ہوتی ہے تو نہ صرف زبان، بلکہ تہذیب و تمدن، رسم و رواج، نشست و برخاست، سب ہی میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تبدیلی مہینوں یا برسوں کا معاملہ نہیں ہے۔ اس کو صدیاں لگ جاتی ہیں لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود اس قوم کے بنیادی اصول میں حقیقتاً کوئی اختلاف واقع نہیں ہوتا، اصل قوم کی روایات اکثر وہی رہتی ہیں۔ اگرچہ اکثر نام بدل جاتے ہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہوتا ہے کہ مکان اور ماحول کے مطابق واقعات کی اہمیت یا شخصیتوں کے خواص بدل جاتے ہیں یا ان کی صفات میں ترمیم ہو جاتی ہے، نام ہر حالت میں وہی رہتے ہیں فقط لہجے بدل جاتے ہیں۔ پھر یہ وقت بھی پیش آتی ہے کہ اگر ایک قوم کا رسم الخط دوسری قوم کے رسم الخط سے بالکل ہی مختلف ہو اور نہ ہی اس میں اتنے حروف ہوں، اور نہ ہی اتنی ترکیبیں، تو پھر ایسی تحریروں کا حل یعنی DECIPHERMENT۔ مشکل ہو جاتا ہے۔ خط میخی کے جسقدر کتبے (CONEIFORM WRITINGS.) بھی آج کل حل ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں۔ ان تمام میں ہمیں ایک چیز بہت نمایاں نظر پڑتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک بادشاہ کا نام مختلف مقاموں سے حاصل شدہ کتبوں میں مختلف ہے۔ دراصل ان میں اختلاف نہیں ہوتا بات یہ ہوتی ہے کہ جس زبان سے یہ نام حاصل کیا جاتا ہے تو اس کو خط میخی میں نقل کرتے وقت حروف میں مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر جب ہم اس کو حل کرتے ہیں یعنی اس کو DESIPHER کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس قسم کا بادشاہ جس کی خصلتیں تھیں اور جس نے یہ کام کئے تھے، ایک اور قوم میں بھی ہو چکا ہے۔ حالانکہ بادشاہ ایک ہی

Marfat.com

ہوتا ہے جو مختلف مقامات پر حکمراں ہوتا ہے اس لئے تمام روایات اور قصے مل جاتے ہیں ماہرینِ فن نے بعض اوقات ان واقعات اور روایات کا باہم تعلق ثابت کرتے کرتے بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ حالانکہ اگر حل کرتے وقت یہ حقیقت معلوم ہو تو اس کو وہیں درست کر دینا چاہیئے۔ نہ کہ بعد میں بال کی کھال نکالی جائے۔

اس چیز کا ہم کو ایک نقصان یہ ہوا ہے کہ موجودہ زمانے کی جو تحقیق قدیم تاریخ کے متعلق ہمارے سامنے موجود ہے اس میں مختلف جگہوں سے برآمد شدہ بادشاہوں کی فہرستیں بہت حد تک ایک ہیں مگر حقیقی مطابقت کا ثابت کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ہم نے گذشتہ اوراق میں راجہ دسرتھ کا ذکر کیا تھا۔ ہمارے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ راجہ دسرتھ عراق کے شمال میں حکمراں تھا مگر اس کے لڑکے رامچندر کے نام میں اسقدر نقل واقع ہو چکی ہے کہ وہ کسی طرح بھی رامچندر کا والد ثابت نہیں ہو سکتا۔ اکشواکو (IKSHWAKU) جو آرین نسل کا سب سے پہلا بادشاہ تھا اور جس کا نام مہابھارت اور گیتا میں بھی ملتا ہے اس کا نام ہمیں اکثر کتبوں میں ملا ہے۔ نہ ہی صرف یہ بلکہ سارگون اعظم (SARGON THE GREAT -) یا ساگر کے متعلق ہمارے پاس متعدد اسناد موجود ہیں کہ یہ دونوں سرزمین عراق پر حکمراں تھے۔ خیر وہ تو ایک تاریخی پہلو ہے، ہمیں غرض صرف ان ناموں کے ساتھ ہے۔ ذیل میں ہم قارئین کرام کے سامنے ایک نقشہ پیش کریں گے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ سارگون اعظم (بعض مورخین اسے شارغون بھی کہتے ہیں) کے نام میں کس کس قسم کا اختلاف پیدا ہوا۔ پیشتر کہ ہم یہ نقشہ پیش کریں ہمیں لفظ فرعون سے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

لفظ فرعون سے متعلق تحقیق اس لفظ کے متعلق حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے قصص القرآن میں نہایت مدلل بحث کی ہے۔ ہم تمہید کے طور پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا بیان لیتے ہیں جو کہ زیادہ تر ترجمان القرآن ہی کی تفصیل پر مبنی ہے مولانا فرماتے ہیں:۔

Marfat.com

"مصر کے مذہبی تخیل کی بنا پر اس کا لقب فاراع (فرعون) تھا۔ اس لئے کہ مصری دیوتاؤں میں سب سے بڑا اور مقدس دیوتا آمن را (سورج دیوتا) تھا۔ اور بادشاہ وقت اس کا اوتار اور "فاراع" کہلاتا تھا۔ یہی فاراع عبرانی میں فارعن اور عربی میں فرعون کہلایا۔"

سطورِ بالا سے ہمیں کچھ اطلاع لفظ فرعون سے متعلق ملی۔ مگر اتنا کافی نہیں۔ ہمیں ذرا اور غور کرنے سے قدیم تاریخ کے اندر ایک شخصیت، جس کا ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ موسوم بہ سارگون اعظم ملتی ہے۔ جو اپنے وقت میں دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر حکمراں تھا۔ اور ویڈل[1] صاحب کا قول ہے کہ وہ مصر پر بھی حکمراں تھا اور وادیٔ سندھ میں بھی اس کی راجدھانی تھی۔ اس کا ایک لڑکا جس کا نام ہم بتا چکے ہیں یعنی منیز (MENES) سندھ کا گورنر تھا۔ اس کا کچھ اختلاف اپنے باپ کے ساتھ ہو گیا اور اس نے بغاوت کر دی اور کچھ فوج لے کر مصر بھاگ گیا۔ اس پر قابض ہونے کے بعد اس نے اپنے آپ کو پارُو (PARU) کہلانا شروع کیا۔ اس کی کچھ مہریں جو مصر سے برآمد ہوئی ہیں اس پر اس نے اپنے آپ کو پارُو یا فرعون لکھا ہے۔ اس کا زمانہ تقریباً ۳۷۵۰ء قبل مسیح تھا۔ چونکہ ہمیں اس وقت الفاظ و اصطلاحات کی ساخت و ترکیب سے تعلق ہے ہم تاریخی تشخیص کو تفصیل سے بیان نہیں کرتے ورنہ یہ سند ہمیں اور بھی متعدد کتابوں میں ملتی ہے۔

اب ذرا غور فرمائیے کہ عربی و عبرانی زبانوں کے رسم الخط میں صرف "پ" یعنی (P) نہ ہونے کی وجہ سے اس کو "ف" یعنی (F) کے ساتھ بدل دیا گیا ہے۔ جس طرح پارسی کو فارسی بنا دیا گیا تھا! اسی طرح یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ یہ لفظ کسی وقت میں پارُو ہی ہو۔ اور عربوں نے

---

[1] THE MAKERS OF CIVILISATION IN RACE & HISTORY BY L. A. WADDELL L.L.D., C.B., C.I.E, LUZAC 1929

Marfat.com

اس کے ساتھ "ف" لگا کر اس کو فاروُ یا فاراع یا فرعون بنا دیا ہے۔ مسٹر جنا[1] لکھتے ہیں کہ فرا (PHRA) سیامی (SIAMESE) زبان میں ایک لفظ ہے جو دراصل خدا کے معنی دیتا ہے مگر بعد میں اس سے مراد بادشاہ لیا جانے لگا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ فرا اسی فرعون کی ایک ابتدائی شکل ہے۔ اس لفظ کے ارتقاء کے سلسلے کی ایک کڑی ابھی اور باقی ہے۔ اور وہ لفظ پربھو (PRA-BHV) ہے۔ یہ سنسکرت (SANSKRIT.) زبان کا لفظ ہے۔ اور اس کے معنی بادشاہ یا حاکم کے ہوتے ہیں یعنی .LORD OF THE LAND ہماری تحقیق یہ بتاتی ہے کہ یہ لفظ بھی سومیری زبان سے اخذ کیا گیا ہے اور اس کا اصل لفظ بر (BAR) اور برُو (BARU) ہے جس کے معنی بھی بادشاہ اور حکمراں کے ہیں۔ اس سومیری لفظ کو جب آرین ہندوستان میں آئے تو برہمنوں نے منتقل کیا ہوگا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب سارگون اعظم مصر پر حکمراں تھا، اور اس کو اس طرح منتقل کرنے سے شاید مقصد بھی یہی تھا کہ اب وہ مصر کی سرزمین پر حکمراں ہو کر فرعون (PHAROAH) کہلایا۔ چنانچہ PARU BARU کا بنا اور اس PHRA اور پھر PHIR'ON (فرعون) بن گیا۔

اس ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میر جہانگیر علی خاں لکچرر گلبرگہ کالج دکن، کی ایک تحریر سے بھی قارئین کرام کو آشنا کروا دیا جائے۔ موصوف نے ہمارے ایک مقالے کی تائید میں ایک مفید مگر مختصر سا مضمون ندوۃ المصنفین کے مجلۂ شہریہ "برہان" میں ۱۹۴۵ء میں شائع کروا یا۔ اس میں انھوں نے لفظ پُر (PUR) پر نہایت دلچسپ بحث کی ہے۔ ہم اس مقالے کے جستہ جستہ اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں کہ "سنسکرت میں پُر[2] کے معنی بڑی بستی کے ہیں یہ لفظ بعد میں چل کر اس سے نکلی ہوئی زبانوں میں پورا اور پوری ہوگیا۔ جیسے رامپور، اور

---

[1] A BRIEF HISTORY. OF EASTERN ASIA. LONDON-1900

[2] یا پُر کے معنی بسنے والے ہیں۔

جگناتھ پوری وغیرہ۔ ایک قیاس تو یہ ہے کہ یہی لفظ پُر دڑاوڑی زبانوں میں آکر اُر ہو گیا اور پھر پُر کے وزن پر اُور بن گیا۔ اور اس قیاس کی بھی گنجائش ہے کہ دڑاوڑی زبان کا اُر آریائی زبانوں میں پُر ہو گیا ہو۔" پھر ایک اور جگہ پر موصوف ایک نوٹ میں یہ بتاتے ہیں۔ "پریاگ ایک مرکب لفظ ہے۔ پر کے معنی جلدی اور یاگ کے معنی جانا۔ یعنی جلدی جانا۔ کیونکہ یہ گنگا اور جمنا جیسے پوتر دریاؤں کا سنگم ہے اس لئے جو یہاں اشنان کرے وہ جلد از جلد پرلوک اور پرماتما تک پہنچے"

ہم نے اس اقتباس کو یہاں اس لئے درج کر دیا ہے تاکہ پُر (PUR) اور پَر (PAR) کی طرف بھی نگاہ ہو جائے۔ درحقیقت یہ لفظ بھی پارَد اور پَرا ہی سے اخذ شدہ ہیں۔ عربوں کو اگر پریاگ کا پتہ چلتا تو غالباً یہ منتقل ہو کر فریاد بن گیا ہوتا!! یا کم از کم فریاق تو ضرور کہلایا ہوتا!!!

یہ جو اشارات ابھی کئے گئے ہیں ان کو مکمل کرنے سے پیشتر ہم ایک اور بات واضح کرنا چاہتے ہیں جو اس وقت ہمارے ذہن میں آگئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں متعدد نسلیں موجود ہیں اور ان کی متعدد ہی زبانیں ہیں۔ انسانیت کا آغاز ایک ہی آدم علیہ السلام سے ہوا۔ لہذا سب کی زبان شروع شروع میں ایک ہی تھی۔ چنانچہ تورات بھی اس بات کی شاہد ہے۔ یہ جو نظریئے میکس مولر (MAX·MULLAR) وغیرہ نے بنا دیئے ہیں۔ سامی اور غیر سامی اقوام کے متعلق تو یہ محض عارضی ہیں۔ ہن کا یہ مطلب نہیں کہ سامیوں کا باوا آدم اور تھا اور غیر سامیوں کا اور! لیکن جب آہستہ آہستہ آبادی میں اضافہ ہوا تو وہ گرد و نواح میں پھیل گئی۔ انسانیت کا اولین فرد۔ خواہ آپ سائنس کی نگاہ سے دیکھیں یا مذہب کی رُو سے ایک ہی تھا اور یہ تھا بھی ایک ہی مقام پر۔ اور اسی ایک مقام سے انسانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے سیلاب مختلف اطراف میں امنڈ پڑے۔ زمانے کے حوادث اور موسموں کا تغیر و تبدل۔ ان گروہوں کو جگہ جگہ لئے پھرا اور ہر موافق مقام میں یہ صدیوں تک جاگزیں رہتے۔ تاوقتیکہ موسموں کی ناموافقت نے ان کو کسی بہتر جگہ کی تلاش میں سرگرداں کر دیا ہو۔ اور چونکہ کرۂ ارضی کا موسم ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اور کئی بار

Marfat.com

بدل چکا ہے۔ یہ گروہ اوّل اوّل خانہ بدوشوں کی طرح مارا مارا پھرتا رہا۔ اور پھر جب ان کا ذہنی ارتقاء اسقدر ترقی کر گیا کہ یہ ایک تمدن کی بنیاد رکھتے۔ حکومتیں قائم کرتے اور بہت سی ترقی بھی کرتے مگر پھر ایک وقت آتا جب ان میں دوبارہ حرکت پیدا ہو جاتی۔ یا تو یہ تلاش معاش کی وجہ سے ہوتا۔ یا یہ کہ یہ اسقدر اقتدار میں بڑھ جاتے کہ دوسرے ملکوں پر دھاوا بول دیتے۔ تاکہ اپنی راجدھانی کو بڑھائیں۔ جن ملکوں پر حملہ آور ہوتے۔ وہ درحقیقت انہی کے اپنے ملک ہوتے تھے۔ جہاں اب ان کے بھائی بند وغیرہ رہتے تھے۔ غرضیکہ ہزار ہا سال تک یہ سلسلۂ دوران ماقوام جاری رہا۔ اور یہ اقوام بار بار اپنے اصلی مرکز کی طرف لوٹ لوٹ کر آتی ہیں۔ اب یہ کہنا کہ ایک خاص قوم دنیا کے کسی خاص حصہ کے ساتھ وابستہ ہے، تو یہ بالکل غلط ہے۔ مثلاً مستشرقین ہمیشہ یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ آرین اقوام یا تو جنوبی قفقاز سے آئیں اور یا پھر وسط ایشیا سے آئیں۔ بال گنگا دھر تلک اپنی کتاب (ARTIC HOME IN THE VEDAS) میں فرماتے ہیں کہ آرین دراصل قطب شمالی سے آئے۔ ہمارے نزدیک یہ کہنا بھی غلط ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقام وہی مرکز ہے جہاں انسان اوّل حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ خواہ وہ مقام کہیں بھی ہو۔ اگر یہ اقوام وسط ایشیا یا قطب شمالی سے آئیں تو کچھ عرصہ پیشتر یہ وہاں نہ تھیں۔ بلکہ اپنے اصلی مرکز سے حرکت کر کے وسط ایشیا میں پہنچیں یا مشرق وسطیٰ میں لوٹنے سے پیشتر وسط ایشیا سے قطب شمالی کی طرف جا چکی تھیں۔ جہاں سے وہ پھر دوبارہ لوٹیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کا اصل مقام تعین کرنے کے لئے قرآن کریم کی یہ آیت بس کرتی ہے۔ تمام نظریوں سے بہتر نظریۂ اقوام یہی ہے۔ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ
لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبَارَکًا وَّھُدًی
لِّلْعٰلَمِیْنَ ط

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی بنیاد جو رکھی گئی تو وہ حضرت آدم علیہ السلام

ہی کے ہاتھوں رکھی گئی، اور یہ جگہ مکہ تھی جو کئی ہزار سال کے بعد تباہ ہو گیا تھا۔ مگر پھر ایک بار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں یہ آباد ہوا۔ اور اس کی تعمیر انھیں اوّلین بنیادوں پر ہوئی جن کے آثار قائم و محفوظ تھے۔ ایک جگہ کا بیت اللہ کہلانا اس کی مرکزیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جہاں ہر طرف سے لوگ بہ آسانی رسائی حاصل کر سکیں۔

ثابت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد بھی اسی کے گرد و نواح میں اوّل اوّل پھلی پھولی اور یہیں سے دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل گئی۔ تاریخ کا ایک بہت طویل زمانہ ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے اور اگر کبھی کچھ نظر بھی پڑتا ہے تو اس کے بعد ہزارہا سال تک ہماری نظروں سے سب کچھ بوجھل ہو جاتا ہے۔

قدیم تاریخ کے ماہرین جدید تحقیق کو مدنظر رکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ دجلہ و فرات کی جو تہذیبیں تھیں وہ دنیا کی تاریخ میں قدیم ترین تہذیبیں تھیں۔ چنانچہ حال ہی میں یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ مصر و چین کی جو تہذیبیں تھیں وہ دجلہ و فرات کی تہذیبوں سے بہت بعد کی تھیں۔ حالانکہ جو ثبوت اب تک فراہم ہو چکے ہیں وہ صرف اتنی بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ جو جو تہذیبیں اس وقت معلوم ہو چکی ہیں۔ ان میں سب سے قدیم بابلی۔ کلدانی اور حتّی تہذیبیں ہیں۔ مگر ان اقوام کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جن کے حالات ابھی ظاہر ہی نہیں ہوئے۔ اور جن کا زمانہ ابھی تک ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ والقصہ لطویلہا۔ ہمارے کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جو تہذیبیں ہمیں مختلف وقتوں میں نظر آتی ہیں ان سب کا سلسلہ ایک ہی تہذیب اور تمدن سے شروع ہوتا۔ اور جہاں جہاں یہ گروہ بستے چلے گئے وہاں وہاں اب ان کے آثار ملنے شروع ہو گئے ہیں۔ اصل حقیقت کے لئے نگاہِ شوق ابھی منتظر ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آرین اقوام دجلہ و فرات کی وادی ہی سے وسط ایشیا کی طرف بڑھیں اور یہ دجلہ و فرات کی تہذیب کو اپنے ساتھ لے گئیں اور جب انھوں نے وہاں قیام کیا تو اس تہذیب میں اور بہت کچھ اضافہ کیا۔ کئی صدیوں کے بعد ہمیں وہ دوبارہ

ایران میں لوٹتے نظر آتے ہیں۔ ان کے مختلف گروہوں کا نقشہ گذشتہ باب میں درج کیا جا چکا ہے قارئین کرام ایک بار پھر ملاحظہ فرمالیں تاکہ اصل مقصود صاف ظاہر ہو جائے۔

اسی طرح جب یہ اقوام اپنے مرکز سے شمال کی طرف بڑھیں تو کچھ کچھ گروہ جنوب کی طرف بھی حرکت کرتے رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن میں سورۂ طٰہٰ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"نسل انسانی کے اقوام انشعاب کا ایک مرکزی سرچشمہ جزیرہ نمائے عرب بھی رہ چکا ہے یہاں کے صحراؤں میں یکے بعد دیگرے نسل انسانی کا مواد بنتا رہا اور پھر ابل ابل کر دور دور تک پھیلتا گیا۔ فلسطین۔ عراق۔ شام۔ آرمینا۔ اور خلیج فارس کی ساحلی آبادیاں سب اسی مرکزی نسل کا انشعاب تھیں۔ اور سب کا تمدن اسی عربی نسل کا تمدن تھا۔"

یہ بالکل وہی بات ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔ یعنی آدم علیہ السلام اسی ایک مرکز میں پیدا ہوئے اور یہاں ہی اولادِ آدم بڑھتی گئی اور کچھ وقت گزرنے پر ان کی نقل و حرکت مختلف اطراف میں شروع ہو گئی۔ اور یہاں ہی سے نہ صرف فلسطین، شام۔ عراق اور آرمینا گئے۔ بلکہ ادھر ہی سے انکے گروہ وسط ایشیا اور قطب شمالی۔ مصر اور جنوبی ہندوستان میں بھی پہنچے جو اب مختلف شکلوں سے پہچانے جاتے ہیں اور مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ ان تمام کی شکلیں ایک تھیں۔ ان تمام کا نام ایک تھا۔ اور ان سب کی زبان ایک تھی۔ اور وہ زبان عربی تھی۔ ان تمام کا مذہب ایک تھا اور وہ اسلام تھا۔ عربی زبان ہی میں حضرت آدم علیہ السلام پر اولین دفعہ وحی ہوئی اور یقیناً آخری وحی بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر عربی زبان ہی میں ہوئی۔ اس لئے اللہ تعالےٰ قرآن کریم کو زبان عربی میں اتارا۔ کیونکہ یہ نسل انسان کی پہلی اور آخری زبان تھی۔ اور باقی سب زبانیں اسی ایک زبان سے پھوٹ پھوٹ کر نکلی تھیں۔

اب لطف کی بات یہ ہے کہ جو اقوام اس مرکز سے شمال کی طرف بڑھ کر پھر واپس لائیں تو ان کا نام

Marfat.com

مستشرقین نے آرین اقوام رکھ دیا۔ اور جو وہاں ہی قیام پذیر رہیں یا جنوب کی طرف حرکت کر گئیں ان کو سامی اقوام کہا گیا اگرچہ اسی تقسیم کے لوازم اور بھی ہیں۔ تاہم یہی سب سے ضروری ہیں۔ شمال کی طرف جانے والے لوگ تو ہم کہہ چکے ہیں کہ قطب شمالی تک پہنچے اور تبت سے ہوتے ہوئے چین اور جاپان چلے گئے ایک طرف قفقاز اور ترکستان سے ہوتے ہوئے روس اور یورپ میں بھی پہنچے۔ اب جو اقوام جنوب کی طرف سے بڑھیں وہ زیادہ تر سمندر کے راستے یا ساحلوں کے ساتھ ساتھ دوسرے ملک میں وارد ہوئیں۔ ہندوستان کا مغربی کنارہ اس وقت افریقہ کے مشرقی ساحل کے ساتھ ملا ہوا تھا اور حجاز عرب کا جنوبی حصہ شمالی مصر اور مغربی ہندوستان کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ لہٰذا ان تمام ممالک میں نقل و حرکت خشکی کے راستہ ہی اوّل اوّل ہوئی۔ ہندوستان پہنچکر ان میں سے کچھ برما اور دیگر جزائر میں چلی گئیں۔ اور جزائر سے آسٹریلیا جا پہنچیں۔ پھر جو قومیں دور و دراز ملکوں میں اسی طرح جا بسیں وہ واپس نہ لوٹیں۔ ایک تو فاصلہ اسقدر زیادہ دوسرے سفر کی تکالیف، اس لئے واپسی ممکن نہ ہو سکی۔

مگر یہ زیادہ ترقی نہ کر سکے کیونکہ اصل مرکز سے دُور نکل چکے تھے۔ اور نہ ہی ان کا تصادم ترقی یافتہ گروہوں کے ساتھ ہوا۔ تاوقتیکہ ذرائع آمد و رفت میں آسانی پیدا نہ ہو گئی۔ چنانچہ یہ انھیں اوّلین مہاجر گروہوں کے آثار ہیں جو اب ہمیں امریکہ میں مندروں کی شکل میں مل رہے ہیں۔ یہ ان کے عبادت خانے تھے۔ اور چونکہ یہ گروہ باقیوں سے بالکل کٹ چکے تھے۔ اس لئے وحشی کے وحشی ہی رہے۔ اور انھوں نے کوئی ترقی نہ کی۔ اور جو ترقی پسند تھے۔ انھوں نے حکومتوں کی بنیادیں رکھیں۔ مختلف گروہوں کو حالات کے مطابق اور اپنی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایجادات کرنا پڑیں تاکہ زندگی بسر کرنے میں سہولت پیدا ہو جائے۔ اسی طرح انھوں نے سائنس کے ابتدائی اصولوں کی بنیاد رکھی اور بہت سے گروہ ایسے بھی تھے جو موسموں کی ناموافقت کے زیر اثر معدوم بھی ہو گئے انہی اقوام کے وہ ڈھانچے ہیں جو اب ہمیں فوسلز (FOSSILS) کی شکل میں آج کل مل رہے ہیں موہنجوداڑو اور ہڑپا کی تہذیبوں کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ آرین تہذیبیں نہ تھیں

ہم اس سے متعلق پہلے عرض کر آئے ہیں کہ یہاں واقعی ایک تہذیب ضرور موجود ہو گی ....
...... آرین تہذیب کی بنیاد انھیں گروہوں نے رکھی تھی جو ہندوستان پہلے پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ وہ اقوام دڑاوڑ (DRAVIDIANS) کے نام سے مشہور رہیں۔ غرضیکہ جہاں جہاں یہ گروہ گئے وہاں کچھ عرصہ کے لئے آباد ہوتے چلے گئے۔ اور ساتھ ساتھ ایک عارضی تہذیب بھی قائم کرتے گئے۔ ان کے روابط دوسرے گروہوں سے بھی رہے۔ چنانچہ یہ بات کہ وادی سندھ کے قدیم لوگ بابل کے لوگوں سے راہ و رسم رکھتے تھے کتبات سے ثابت ہو چکی ہے۔

آرین اقوام کی آمد اور دوسرے گروہوں کا مدوجزر اس بات کا مسلّم ثبوت ہے کہ تمام اقوام مختلف وقتوں میں اپنے اصلی مقام سے ہجرت کر کے آئی تھیں۔ اور ان کا تصادم وقتاً فوقتاً دوسری اقوام سے ہوتا رہا جس سے ایک مخلوط تہذیب پیدا ہو جاتی۔ ایک نئی زبان بن جاتی اور مذہب میں ایک نیا رنگ آ جاتا۔ آپ اسی امر کا ہندوستان پر مسلمانوں کی آمد کے بعد۔ اثر دیکھئے تو آپ پر یہ بات واضح ہو جائے گی۔

جو الفاظ ایک زبان سے دوسری زبان میں فوراً ہی منتقل کئے جاتے ہیں وہ عموماً صفات اور اسماء پر مشتمل ہوتے ہیں ان میں حروف اور ضمائر بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ ان الفاظ کا ذکر ہے جو فوری تصادم کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ورنہ جو تبدیلی الفاظ میں دقت پیدا کرتی ہے اس کا معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔ مذاہب کی اصلی بنیادیں قائم رہتی ہیں اور ہر زمانے میں کچھ اشخاص ضرور ایسے ہوتے تھے جو حقیقت سے آشنا ہوں۔ ہمیں تاریخ قدیم کی جدید تحقیقات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی روایات مختلف اقوام کی تاریخ میں مشترکہ ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ دیوتاؤں کے متعدد نام بھی ایک ہیں۔ مثلاً متھرا اور ورونا آرین دیوتا ہندوستان میں مشہور رہیں اور یہی دیوتا میتانیوں کے بھی تھے!

تفصیل کی گنجائش نہیں۔ ورنہ قارئین کرام کے سامنے اس وقت ایک مستقل فہرست آرین اور میتانی دیوتاؤں کی پیش کی جاتی۔ نیز اور بہت سی روایات ہیں جن میں نہ صرف ناموں ہی کی یگانگت

Marfat.com

ی ہے بلکہ قصوں کے موضوع بھی یکساں نظر آتے ہیں اور بیشتر قدیم مذہبی عقائد بھی مشترکہ ہیں۔ اور ہم
ا چکے ہیں کہ ہدایت کا سلسلہ یکساں اور برابر جاری رہا اگرچہ ان ہدایتوں میں تحریفیں جابجا
ہوئیں۔ دنیا کا کوئی گوشہ نہیں تھا جہاں اللہ تعالےٰ نے اپنے پیغامبر نہ بھیجے ہوں۔ قدیم مذہبی صحیفے
ور قرآن کریم بھی اس کے شاہد ہیں۔ پھر جب فرداً فرداً ہر ایک قوم کو تعلیم دے دی گئی تو ایک
یسے رسول کی ضرورت تھی جو تمام دنیا کے لئے ایک بین الاقوامی شریعت لے کر آئے اور انسانیت کے
ایک بین الاقوامی ضابطے میں جکڑ دے۔ اس منصب اعلےٰ پر اللہ تعالےٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو
سرفراز فرمایا۔ صلی اللہ علےٰ حبیبہ محمد وآلہ وسلم۔ آپ کی شریعت کا پہلا مقصد یہی تھا کہ دنیا کے سامنے یہ
چیز پیش کرے کہ اللہ تعالےٰ نے دنیا کے ہر گوشے میں اپنا پیغام بھیجا جو لوگوں کو متنبہ کرتا۔ مگر اب ایک ایسے
نظام کی ضرورت تھی جو عوام کے لئے ایک بین الاقوامی پروگرام پیش کرے۔ اور ان تمام کو اپنی بھولی
ہوئی تعلیم از سر نو یاد کروا دے اور انسانیت من حیث الجماعت صراط مستقیم کی طرف آجائے
چنانچہ قرآن کریم نے نازل ہوتے ہی اس بات کا اعلان کر دیا اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ تمام قدیم مذاہب
نے اپنی اپنی مقدس کتابوں کی چھان بین شروع کر دی اور اصل حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے
عیسائیت اور ہندو ازم تثلیث کے معتقد تھے۔ مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی
شریعت پیش کی تو اس نے ان عقائد کو بنیادوں تک متزلزل کر دیا۔ عیسائیت میں خود حضرت
عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کے متعلق شکوک پیدا کر دیئے اور ہندوؤں نے بجائے تثلیث کے ادوائتا کا
(ADVAITA) کا فلسفہ اختیار کیا۔

تثلیث کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن ج دوئم ص ۴۴۵ پر فرماتے ہیں :-

"اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اضافی سراپیز (SERAPIS) سے تثلیثی وحدت کی اصل لی گئی
اور ایزیس (ISIS) کی جگہ حضرت مریم کو اور ہورس (HORUS) کی حضرت مسیح کو دی
گئی"۔

یہ تو بیان درست ہو جہاں تک مسیحیت کا تعلق ہے۔ رہی یہ بات کہ ہندو مذہب میں برہما۔

وشنو اور شوا کی تثلیث کس طرح قائم ہوئی تو اس کے متعلق ہمارے تاثرات ذیل میں درج ہیں۔

ہم نے گذشتہ اوراق میں مولانا حمید الدین صاحب کی ایک تحقیق بیان کی تھی۔ یعنی :-

"خدا تعالٰے کے نام کا یہ مادہ "لا ہ" مذہبی دنیا کا قدیم ترین لفظ معلوم ہوتا ہے جو تمام مذاہب میں معمولی اختلاف سے مستعمل ہوتا رہا ہے"۔

اس لفظ "لا" میں وحدانیت پنہاں ہے اور ہم کچھ تفصیل کے ساتھ اس حقیقت کی تحلیل پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہندوؤں میں تثلیث کا نظریہ قائم ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے محکمات[1] اور

---

[1] مقطعات دراصل از قسم متشابہات ہی ہیں۔ محکمات اور متشابہات سے متعلق ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو آیات صاف اور واضح ہیں جن میں قطعاً تاویل و تشریح کی گنجائش نہیں اور احکام بعینہٖ ویسے ہی جو بیان کر دیئے گئے ہیں تو وہ آیات محکمات ہیں مختصر یہ کہ احکام روز روشن کی طرح واضح ہیں۔ بعض آیات میں تاویل اور تشریح کی گنجائش ہے اور ان کے معانی صحیح طور پر سمجھ نہیں آتے۔ ایسی آیات کی تعداد بہت کم ہے۔ یہ از قسم متشابہات ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے معنی کبھی کسی کو سمجھ نہ آئینگے یہ آیات صاحب بصیرت کے لئے تحقیق کا میدان ہیں۔ اور جوں جوں سائنس اور تاریخ اور دیگر علوم ترقی کرتے جاتے ہیں ان کے معنی بھی کھلتے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو ایک آیات کا ذکر یہاں کرتے کرتے ہیں جو کچھ عرصہ ہوا متشابہہ تصور کی جاتی تھیں مگر اب تحقیق نے انھیں محکم بنا دیا ہے اول فرعون موسٰی کا جو ذکر قرآن میں ہے تو لوگوں کو اس کی سمجھ نہیں آیا کرتی کہ اس سے کیا مطلب ہے، مگر جب رمیسیز دوئم (Ramesis II) کی لاش (Rummy) دستیاب ہوئی اور تحقیق نے بتا دیا کہ یہی فرعون موسٰی ہے تو یہ متشابہہ آیت محکمہ بن گئی۔ اسی طرح سورج کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ یہ گردش نہیں کرتا۔ حالانکہ قرآن حکیم صریحاً یہ بتا رہا ہے کہ تمام اجرام فلکی تجری ہیں۔ اب جبکہ یہ ثابت ہو گیا کہ واقعی سورج بھی گردش کرتا ہے تو قرآن کریم کی ایک اور متشابہہ آیت محکمات بن گئی ایک اور

(باقی صفحہ ۹۵ پر)

متشابہات پر مدلل مباحث کئے ہیں۔ اور یہ بات بھی پیش کی ہے کہ حروفِ مقطعات کے علم کا احاطہ کرنا ممکن ہے۔ امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اس سے متفق ہیں۔ ہمیں اس بات سے انکار ہے ہم ان علماء کے پیشِ نظر جو بات تھی اسے خوب سمجھتے ہیں اور جن الجھنوں کو وہ سلجھانا چاہتے تھے وہ بھی ہمارے پیشِ نظر ہے۔ تاہم یہ بات کہ تمام مقطعات اور متشابہات کا سمجھ لینا ممکن ہے۔ ہمارے نزدیک کچھ بعید سا معلوم ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنی عقل کے مطابق ضرور کچھ نہ کچھ تاویل کرلے گا مگر اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ سند ضرور ہونا چاہیئے۔ پھر یہ بات، کہ حضرت جبرئیل نے آنحضرتؐ کو ان کی تاویل بتائی۔ تو اس سے متعلق بھی ہمارے پاس احادیث سے شہادت موجود ہونی چاہیئے اگر نہیں تو پھر سند کیا ہوگی؟ اگر یہ تصور کرلیا جائے کہ ان کے معانی کشف و الہام سے معلوم ہو سکتے ہیں تو یہ ورثہ معدودے چند صوفیائے کرام کا ہے۔ عوام اس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ البتہ ہر انسان اپنی فہم و استعداد کے مطابق جو کچھ اس سے متعلق سمجھے وہ اپنے دل میں رکھے یا صرف اس کو سمجھائے جس کو سمجھنے کی اہلیت ہو۔ جیسے مولانا عبیداللہ سندھی اپنی تصنیف "شاہ ولی اللہ اور انکا فلسفہ" میں ص ۶۲ پر فرماتے ہیں:-

"خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ حروف مقطعات کی تفسیر سمجھانے میں انھوں نے اتنی احتیاط برتی کہ تاکید کردی کہ اس مجلس میں سوائے خواجہ محمدؒ معصوم کے کوئی دوسرا نہ ہو"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹) مثال لیجئے۔ ذوالقرنین سے متعلق سخت اختلاف تھا کوئی کچھ کہتا تھا اور کوئی کچھ، مگر سورۂ کہف کی تفسیر نے جو ترجمان القرآن میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تحقیق کی ہے اس میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ذوالقرنین سائرس تھا۔ اسی طرح وقت گذرنے پر قرآن کریم کی ہر متشابہہ آیت محکمات بن جائے گی۔ پھر کسی کو اس میں شک و تردد کی گنجائش نہ رہے گی۔ ایک وقت آئے گا جب تمام قرآن محکم آیات سے پُر ہوگا اور اس میں متشابہات کا وجود تک نہ رہے گا پھر دنیا اس کے بیان کردہ حقائق سے انکار نہ کرسکے گی اسی لئے تو وہ اپنے آپ کو تفصیل کل شیئ کہتا ہے اور مبین کا لفظ استعمال کرتا ہے جس وقت مقطعات کی بھی تحقیق ہوگئی تو پھر شک کی گنجائش نہ رہیگی لیکن جب تک یہ حقیقت حل نہیں ہوتی ان کی تاویل محض قیاس اور ظن پر مبنی ہوگی۔

قرآن کریم میں خود بہت سے اہم مسائل ہیں جن کی وہ تفصیل سے بحث نہیں کرتا، بلکہ بعض اوقات تو بحث کو بند کر دیتا ہے۔ اس میں بھی مصلحت ہے۔ پھر ایسے واقعات کی تفصیل کرنا جن کے متعلق قرآن عزیز خود خاموش ہے۔ کہاں کی عقلمندی ہے؟ مثال کے طور پر علم الغیب ہی لیجئے یا روح کا سوال جو یہود نے آنحضرت صلعم سے کیا۔ قرآن کریم ہرگز اس کی تفصیل میں نہیں گیا اور اس سے بہتر جواب کوئی ہو بھی نہ سکتا تھا۔ زمانۂ قدیم سے لوگ ہاتھ دھو کر روح کے پیچھے سرگرداں ہیں۔ مگر آج تک نہ کوئی ماہرِ نفسیات اور نہ ہی کوئی فلاسفر اس کی تشریح کر سکا کہ یہ کیا بلا ہے!

نواب ذرا غور فرمایئے، گیتا (GITA) کا آغاز کس طرح ہوتا ہے۔ لفظ "اوم" سے یہ لفظ تین علامات (SYLLABLES) سے مرکب ہے یعنی "ا" "و" اور "م" (A.U.M) انگریزی زبان میں جو ہجے اس کے لئے مستعمل ہیں یعنی "OM" تو یہ غلط ہیں۔ دراصل اردو کا اوم صحیح ترجمانی کرتا ہے اصل سنسکرت کے لفظ کی۔ ہماری نگاہ میں یہ حروف بعینہٖ اسی طرح حروف مقطعات ہیں جس طرح قرآن کریم کے حروف مقطعات خاصکر سورۂ بقرہ کا آغاز "ا ل م" بہت سے احباب کے لئے یہ ایک نئی چیز ہوگی۔ لیکن تصور سے غور کے بعد اس میں کچھ بھی پیچیدگی نظر نہ آئیگی

اب ذرا غور فرمایئے۔ یہ جو لفظ "اوم" ہے یہ ویدوں سے گیتا میں آیا ہے اور گیتا خود ویدوں ہی کی صدائے بازگشت ہے۔ ویدوں میں "اوم" کے معنی بالکل وہی ہیں جو معنی قرآن کریم میں لفظ "رب" کے ہیں! مگر ہندو علماء نے جب اس قسم کی بحثوں میں پڑ کر اپنے حروف مقطعات کی تشریح شروع کی تو فوراً ہی اصل راستے سے بھٹک گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تثلیث کا نظریہ قائم ہو گیا جو کہ ویدوں میں موجود نہ تھا! یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ اوّل اوّل جب توحید کی تعلیم سے انسانیت کو مطلع کیا گیا تو ان کے ذہن ایسے ارتقائی مراحل سے گذر رہے تھے کہ وہ اس بات کو قبول نہ کر سکے بات سیدھی سادی تھی مگر قدرتی مناظر ہر بار خلل انداز ہوتے۔ چاند اور سورج کا اُتار چڑھاؤ زلزلوں کی دہشت سے خوفناک آتشیں شعلے انسان پر اسقدر جلد اثر کرتے کہ وہ یہی سمجھتا کہ اس چیز کے اندر ایک خدا موجود ہے جس کی فطرت انسانی اعمال کے مطابق بدلتی رہتی

Marfat.com

ہے! اور اگر اس کی پرستش نہ کی جائے گی تو بلا ٹل نہیں سکتی۔ ایک طرف تو توحید کی تعلیم تھی جو بغیر کسی کے خدائے واحد پر ایمان لانے کی مقتضی تھی، اور دوسری جانب قدرتی مناظر تھے جن کو انسان شاہد کر کے متاثر ہوتا تھا۔ ان قدرتی مناظر کا قرب اور توحید کے تصور کا بُعد ان تاثرات میں شامل حال رہتا۔ لہٰذا ان قدرتی مناظر کے لئے علیحدہ علیحدہ خدا بنا دیئے گئے!! چاند اور سورج چونکہ ضرر رساں نہ تھے اس لئے ان دیوتاؤں کو اچھی صفات سے منسوب کر دیا گیا۔ اور باقی جو ضرر رساں تھے ان کو ایک ہیبت ناک شکل دیدی گئی۔ اور اسی طرح ان میں ہر ایک کے ساتھ کچھ نہ کچھ صفات بھی چپاں کر دی گئیں۔ چنانچہ ہندوازم میں ادوایتا (ADVAITA -) یعنی توحید کا جو تخیل تھا اس میں انتشار پیدا ہو گیا اور ایک تثلیث قائم ہو گئی۔ کچھ عرصہ ہوا اسلامک کلچر میں ڈاکٹر تارا چند صاحب کا ایک مفید مضمون "دارا شکوہ اور اپنشد" شائع ہوا تھا۔ جس میں موصوف نے لکھا تھا کہ ہندو مذہب میں بھی توحید اسی طرح موجود ہے جس طرح اسلام میں اور بتایا کہ "وحدہٗ لا شریک" کے ہم معنی لفظ یا اصطلاح سنسکرت میں اِکماوَدیوتیم (EKAMAVADUITIYAM) ہے۔ اور اس فلسفہ کو فلسفۂ ادوایتا کہا جاتا ہے۔

بہت ہی حیرت کی بات ہے کہ تثلیث (TRINITY) کا لفظ نہ تو انجیل ہی میں نظر پڑتا ہے۔ اور نہ ہی ویدوں اور اپنشدوں میں۔ اب آخر میں رہی یہ بات کہ ہندو مذہب کی تثلیث کس طرح قائم ہوئی؟ تو اس کے متعلق ہماری رائے یہ ہے۔

جب ہندوؤں نے اپنے حروف مقطعات "اوم" کی تشریح شروع کی۔ تو تشخیص یہ ٹھہری کہ "ا" وشنو (VISHNU) کے لئے ہے۔ "و" شوا (SHIVA) کے لئے ہے۔ اور "م" برہما (BRAHMA) کے لئے۔ گویا کہ لفظ اوم میں جو صفات تھیں وہ تین شخصیتوں میں منقسم ہو گئیں۔ ایک پیدا کرنے والا بن گیا۔ ایک ضروریات پورا کرنے والا۔ اور ایک مارنے والا بن گیا۔ حالانکہ یہ تینوں مفہوم لفظ "اوم" کے اندر موجود ہیں اور آج تک محفوظ ہیں۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ جس چیز کا ادراک ہماری عقل و فہم نہ کر سکے اس کو حل کرنا عموماً

Marfat.com

اس چیز کی اصلیت کو معدوم کرنے کے برابر ہوتا ہے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ یہ جو اختلاف ان دو حروف مقطعات میں ہے یعنی "ال م" اور "ا و م" تو اس میں حرف "ل" اور "و" مختلف ہیں، مگر ان کے ہوتے ہوئے بھی کچھ اختلاف اتنا نمایاں نہیں۔ اوّل تو "اوم" کے معنی وہی ہیں جو "رَبّ" کے ہیں۔ دوسرے "اوم" میں جو "و" ہے تو یہ واحد کے لئے ہے اور "ال م" میں جو "ل" ہے تو وہ "لا" کے لئے ہے! واللہ اعلم بالصواب۔

اب ایک اور حقیقت کی طرف بھی ذرا غور فرمالیجئے۔ جس وقت "اوم" اور "ال م" لکھا جاتا۔ ہماری زبان میں یعنی عربی رسم الخط میں، تو ان دونوں الفاظ کی ساخت میں بہت کم فرق رہتا ہے تھوڑی سی لکیر کو بڑھا دینے سے دونوں "الہ" کا لفظ بن جاتے ہیں۔ مثلاً غور فرمائیے:۔

"اوم" اور عربی رسم الخط میں "اوم" لکھتے وقت "ا" ضرور پہلے آتا ہے۔ اب دیکھئے جب آپ اسی کو دیوناگری رسم الخط میں لکھتے ہیں۔ تو یہ کس طرح "اللہ" کا لفظ بن جاتا ہے۔ دیوناگری رسم الخط میں "اوم" اس طرح لکھا جاتا ہے۔ ॐ۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ ہندی۔ اور دیگر ہندوؤں کی زبانوں میں کچھ نہ کچھ خط کا اختلاف ہوگا۔ مگر اصل سب کی یہی ہے۔ اب ذرا اس کو الٹا کر دیکھئے یعنی کاغذ کی جو لمبان ہے اس کو اپنی طرف کیجئے تو یہ آپ کو اس طرح معلوم ہوگا ﷺ اور پھر یہ اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ کا لفظ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ "ا" (الف) نیچے آگیا ہے اور تشدید ایک طرف کو ہوگئی ہے۔ اور اس نے ہلال اور ستارے کی شکل اختیار کر لی ہے۔

اب وہ بیان جو ہم نے مولانا حمید الدین صاحب کا نقل کیا ہے۔ یعنی

"خدا تعالےٰ کے نام کا یہ مادہ دنیائے مذہب کا قدیم ترین لفظ معلوم ہوتا ہے"۔ تو یہ کس قدر درست ہے۔ یہاں صرف اس قدر اور عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ تین کا جو ہندسہ عربوں نے ہندوستان سے لیا اور عربوں سے یورپ میں پہنچا اسی تثلیث کی صدائے بازگشت ہے اور یہ ہندسہ بعینہٖ وہی بناوٹ (CONSTRUCTION) ہے جو ہم نے ابھی بالا میں درج

Marfat.com

کی ہے۔یعنی اللہ کا لفظ جو لکھا تو ویدوں میں درست جاتا تھا مگر تشریح کر کے اس کی تثلیث قائم کر لی۔اور بعد میں وہی اللہ کے لفظ کے ساتھ ایک اور الف لگا کر اس کو تین کا ہندسہ بنا دیا۔جس طرح "۳"!

یہ قرآن کریم ہی کا معجزہ ہے کہ اس وقت تمام مذاہب اپنی اپنی تعلیم درست کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔بت پرستی فقط معدودے چند ہی میں رہ گئی ہے۔محمود غزنوی بیچارے کو تو خواہ مخواہ کوسا جاتا ہے اب وہی کو سننے والے "ذرا ملاحظہ کیجئے" کیا فرماتے ہیں۔سر رادھا کرشن کا ارشاد ہے :-

"روحانی اقتدار میں پائیدار اور مستقل اصلاح ہماری زندگیوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔لوگوں میں ایک نیا دل وہی مذہب پیدا کر سکتا ہے جو فرد میں تبدیلی پیدا کرنے کو اپنا ایک اصول بنا لیتا ہو اور جو انسان کی روح میں تاریک نقش کی جگہ الٰہی روشنی پیدا کرتا ہو[1]"

اللہ تعالےٰ کی ہستی کا اقرار اگر علانیہ نہیں تو دبے لفظوں میں سب ہی کرتے ہیں۔ہندوؤں میں مذہب فقط برہمنوں کی ملکیت تھا، باقی تین فرقے اس کے قریب بھی نہ بھٹک سکتے تھے۔ مذہب ایسا فلسفہ تھا جو عوام کی سمجھ سے بہت بالاتر تھا۔چنانچہ عوام کے مذاق کو بہلانے کے لئے ان کو یہ دیوتا کھلونوں کی شکل میں دے دیئے گئے کہ وہ ان سے اپنا دل بہلائیں اور روح کی تسکین کریں!

ان تینوں فرقوں کی تعداد برہمنوں سے بہت زیادہ تھی۔لہٰذا اکثریت میں جب یہ چیز پھیل گئی اور ساتھ ہی برہمنوں کے عقائد بھی متزلزل ہونے لگے تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہندو مذہب

---

[1] "EASTERN RELEGIONS AND WESTERN THOUGHT"

LONDON 1937.

ہی ایسا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ چنانچہ تثلیث عام ہوگئی اور ہر پڑھا لکھا اس کو مانتے لگا۔ یہ حالت انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک موجود رہی۔ مگر گذشتہ آٹھ صدیوں میں جو اسلام کا اثر ہندو مذہب پر ہوتا رہا۔ وہ بیسویں صدی کے شروع میں پھل لانے لگا۔ رادھا کرشن اپنے ایک مقالے میں جو (LEGACY OF INDIA) میں شائع ہوا۔ رقمطراز ہیں:۔

" For Hinduism thoug God is formless, he yet informs and sustains countless forms. He is not merely the God of Israel or of Christiandom, but the crown of fulfilment of you and me of all men and of all women, of life and death, of joy and sorrow ..... all forms are directing their steps towards the one God, thoug along different paths."

اس بیان میں ذرا ملاحظہ فرمایئے۔ توحید کی جھلک کس قدر نمایاں ہے۔ نہ ہی صرف یہ بلکہ اللہ تعالےٰ کی سب سے بڑی صفت "ربوبیت" کس طرح تڑپ رہی ہے۔ زندگی اور موت بھی اس کی طرف منسوب ہیں کہاں وہ برہما جو پیدا کرتا تھا اور کہاں وہ وشنو جو مارتا تھا اب ایک ہی کے اندر شامل ہو گئے ہیں۔ اور رجوع الی اللہ کا بھی تصور دیکھئے کتنا صاف نظر آتا ہے۔ یہ اسلام کے اسی اعلان کی تصدیق ہے جس کی صدا ساڑھے تیرہ سو برس سے زائد دنیا میں گونج اٹھی تھی یعنی

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

مام موہن رائے نے جب برہمو سماج کی بنیاد رکھی تو ان کے سامنے بھی یہی بات تھی کہ ہندو مذہب

Marfat.com

میں یہ جو تقسیم انسانیت موجود ہے اس کو اُڑا کر سب کو یکساں کر دیا جائے اور پھر سب کے لئے ایک ہی خدا کی پرستش قرار دی جائے۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور بھی ان کے مداح تھے۔ غرضیکہ جب ان ہندو رہنماؤں نے اس طرف توجہ دینا شروع کی تو لازم تھا کہ عوام کا فہم و ادراک ترقی کرتا۔ اور یہ ایک مسلّم امر ہے کہ جب انسان کا فہم و ادراک ترقی کرتا ہے اور اس میں مذہبی تجسس کا مادہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے معبودوں کی تعداد گھٹنا شروع ہو جاتی ہے اور بالآخر وہ نظامِ کائنات میں ایک وحدت محسوس کرتا ہے۔ اس کو ہر ذرّۂ کائنات میں ایک خدائے بزرگ برتر و دانا کی تخلیق نظر آتی ہے۔ اسکو اس کی ربوبیت کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس کو رب العالمین کہہ کر پکارتا ہے اور اپنی حاجات اس سے مانگتا ہے اور پھر اس کا کثرت کے ساتھ شکر بھی کرتا ہے۔ والقصہ بطولہا۔

اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی علم نقل الکلمہ۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ کچھ نقل اس طرح سے بھی واقع ہو جاتی ہے جس میں الفاظ کی ظاہری شکل تو بدل جاتی ہے مگر حروف تقریباً وہی رہتے ہیں۔ سارگون اعظم (SARGON THE GREAT) جس کی طرف ہم نے گذشتہ صفحوں میں اشارہ کیا تھا۔ اس کا نام مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ اکشواکو (IKSHWAKU) بادشاہ کے خاندان سے تھا۔ اس کے نام کی تفصیل ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔ مختلف تہذیبوں کے کتبوں میں اس کا نام اس طرح مندرج ہے:-

خاندانِ کش KISH	آرق خاندان ERECH	سومیری خط میخی	آرین بادشاہوں کی ہندوستانی فہرست	کتباتِ کش
SHAKIN	GUNNI	URUDUGINA	SHAKUNI	SHARRU-KIN
SHA-GIN	GANNI	BAR-GIN	SAGARA	
SHAGUR		SHAR GANNI	PRA-CIN-WAT	
		BARDUIBUZ	BARDWAJA	

مندرجہ بالا چارٹ کو سامنے رکھئے اور ذیل کی عبارت پر ایک لمحہ کیلئے غور فرمائیے۔ ویڈل صاحب (L. W. WADDELL)

Marfat.com

فرماتے ہیں:-

"The equation of the summerian BARGIN or BARAGIN and BARDUIBUZ with the Indian PRACINWAT and BARDWAJA are note worthy."

یہ جو نام بارگین (BARGIN) اوپر بیان کیا ہے۔ دراصل خط میخی کے کتبوں میں اسی بادشاہ کا نام اُردوگینا (URUDUGINA) لیا گیا ہے۔ موصوف فرماتے ہیں:-

"The Second syllable of that name reads "DU" as well as "KA", and "DU" seems to be the correct form in view of one of the Indus versions giving his name as B'ARDWAJA".

چنانچہ ویڈل صاحب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سارگون اعظم کا اصل نام سارگون نہ تھا، بلکہ "GIR OR GANI, OR SHAR O R SHARGUNNI" تھا۔

اور جو فہرست ہمیں ہندوستان میں ملی ہے اس میں سارگون کا نام کونی (KUNI) یا کُنی یا شرکنی (SHAR KUNI) آیا ہے جس کے ساتھ ساگارا کا لقب چپاں ہے اور اسی ساگارا سے سارگون پیدا ہو گیا۔

اب ایک اور مختصر سی مثال لیجئے۔ اہل یہود کی زبان میں اللہ تعالےٰ کے لئے ILOHA کا لفظ ہے۔ مگر جس ہستی کی وہ عبادت کرتے ہیں اس کا نام تورات میں JEHOVAH ہے۔ یورپین علماء نے

یہ بات ثابت کر دی ہے کہ (JEHOVA) دراصل یہودی لفظ نہیں ہے بلکہ کلدانی لفظ ہے جو YAVHE پکارا جاتا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ یہی لفظ سنسکرت زبان میں YAVHA کی شکل میں ملتا ہے اور ان تمام کے معنی بھی وہی ہیں جو اللہ کے ہیں۔ اس لفظ میں بھی جو اصل بنیاد ہے وہ تمام ساختوں میں قائم نظر آتی ہے۔ صرف حروف کی پوزیشن بعض جگہ بدل گئی ہے یا محض آواز یا تلفظ میں فرق آگیا ہے۔ مگر اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ لفظ ایک ہی ہے۔ اور اس کا مفہوم بھی یکساں ہے! تو پھر جب قرآن کریم کی اس تحقیق نے قدیم مذاہب کو اپنے تئیں نظر ثانی کرنے پر مجبور کیا تو سب نے دبے لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف کیا۔

زبان کا مسئلہ ایک نہایت پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے۔ جس کو ابھی تک وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکا۔ جب ہم بحیثیت مجموعی قدیم تاریخ اور تمدن پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں ایک بات صاف نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ قدیم اور جدید عربی تمام قدیم اور جدید زبانوں میں جذب ہو چکی ہے۔ چنانچہ مستشرقین کے بیانوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جسقدر بھی قدیم کتبے برآمد ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر ملاوٹ عربی زبان ہی کی ہے۔ یہاں تک کہ حمیرابی کی مشہور شریعت بھی عربی زبان میں تھی! اگرچہ رسم الخط میخی تھا۔ اسی طرح بہت سے خط میخی کے کتبات برآمد ہوئے ہیں جن کو حل کرنے کے بعد اگر پڑھا جائے تو بہت سے عربی کے الفاظ ملتے ہیں۔ اس تحقیق کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن کی جلد دوئم میں ص ۸۰۷ پر لکھتے ہیں :-

"یہ زبان جسپر زندگی اور خلود کی آخری مہر قرآن نے لگائی دراصل مدنی نشوونما کے اتنے مرحلوں سے گذر چکی تھی کہ دنیا کی کوئی زبان بھی اس وصف میں اس کی شریک نہیں۔ سمیری اور آکادی اقوام کا تمدن، نینوا اور بابل کی علمی کامرانیاں۔ قدیم مصری لغات کا عمرانی سرمایہ۔ آرامی زبان کا عروج و احاطہ۔ کلدانی اور سریانی کا

---

a. GITA RHASYA BY B.G.TILAK VOL II

Marfat.com

ادبی تمول - دراصل ایک ہی زبان کی لغوی تشکیل و تکمیل کے مختلف

اور اسی نے آگے چل کر چوتھی صدی قبل مسیح میں عربی کا بھیس اختیار کیا"

اب ہم چند امثال نقل الحروف کی یہاں - ارض القرآن سے پیش کرتے ہیں سید

سلیمان ندوی صاحب فرماتے ہیں :-

"جب ایک نام ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو جاتا ہے۔ تو بعض حروف کا خصوصیتِ زبان کی وجہ سے مبادلہ ہو جاتا ہے"۔

مولانا نے چند حروف کا نقشہ پیش کیا ہے - جو کہ اس بات کے سمجھنے میں بہت مفید ثابت ہو گا - ہم اسے بعینہٖ یہاں نقل کرتے ہیں :-

وہ حروف جو باہم بدل جاتے ہیں	امثال
ا اور ہ - ح - ع	آجر اور ہاجر، امورافی اور حمورافی، اسمائیل اور اسماعیل
پ اور ب - ف	پاران، اور باران، فاران -
ت اور ث	تیئت اور ثیئت
تھ اور ث	تھمود اور ثمود
ث، س اور ص	عیثا، اور عیسیٰ، عیصاؤ -
ج اور غ، گ، ی	ہاجر، ہاغر اور آگر، جقطان، یقطان
س، اور ش	سبا اور شبا
ص، اور ض	حصارموت، اور حضارموت
ض، س، ز، ہ	اضحاک، اور اسحاق، حدرموت، اور حضرموت
ط، اور ت	بابط اور نابت
ع، اور ا	یارح اور یعرب
غ، اور ج، گ	ہاجر اور ہاغر
ق، اور ک	اضحاک، اور اسحاق، قیدار اور کیدار
م، اور ن	عمرام اور عمران
ی، ج اور ع	یرح، اور جرح، یاجرہ، میتار اور سعار

ارض القرآن میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی چند اور مقامات پر نقل کلمہ سے
ن اظہار خیال کرتے ہیں، ہم اس کے کچھ اور اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں کیونکہ ہمارے
موضوع کے ساتھ یہ بات ملتی جلتی ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں:۔

"عرب کی صحیح روایات میں فاتح مصر کا نام شدّاد ظاہر کیا گیا ہے۔ مانیتو نے سلاط لکھا ہے
حقیقت میں یہ دونوں لفظ معنیً ایک ہی ہیں۔ شدّاد کے معنی قوی اور جابر کے ہیں اور سلاط
بھی سامی زبانوں میں یہی معنی رکھتا ہے۔ جس سے عربی زبان میں سلطان، اور سلطنت اور سلط
نکلے ہیں"

اسی طرح سید صاحب لفظ سوس کے متعلق بھی اپنی تحقیق بیان کرتے ہیں:۔

"سوس کا لفظ تو خالص عربی ہے، سوس کے اصلی معنی نگرانی اور انتظام کے ہیں۔ اس مناسبت
سے چرواہے کو بھی سوس ابتداءً کہتے ہونگے۔ جس سے منتقل ہو کر گلہ بانی سے جہان بانی کے لئے
عربی میں یہ لفظ مستعمل ہوا۔ اس ماخذ سے سیاسیتہ کا لفظ اب عام طور سے اسی معنی میں بولتے ہیں
(سیاسیتہ کا اصل مادہ لغت میں یہی سوس ہے) معنی اول یعنی گلہ بانی و چوپانی کا اثر صرف
ایک لفظ میں ہمارے ہاں باقی ہے یعنی شیس خادم اسپ، عجب نہیں عبری میں یہیں سے
لفظ صوص (סוס) گھوڑے کے لئے استعمال ہوا ہو"

غرضیکہ ماہرین علم الآثار قدیمہ نے زمینوں کے پیٹ چاک کر دیئے تاکہ اس تحقیق کی سند
حاصل کر سکیں۔ ہم نے بھی کچھ کھیل اس قسم کے دجلہ و فرات کی وادی میں ہوتے دیکھے
مگر نتیجہ یہ نکلا کہ طرح طرح کے کتبے ہاتھ لگتے رہے۔ بعض تو حل ہو گئے اور بعض نے انسانی
عقل و فہم کو دنگ کر دیا۔ اتنا ضرور ہوا کہ طرح طرح کے نام اور اصطلاحات حل ہوئے جن سے
کچھ کھوج ضرور چلا۔ مگر ماہرین فن بجائے اس تطبیق کو کارآمد ثابت کرنے کے انھوں نے مختلف
مذاہب پر حملے شروع کر دیئے چنانچہ بتایا گیا کہ یہودیوں کا مذہب کلدانیوں سے لیا گیا ہے۔
اور یورپین علماء نے تو یہ بھی کہدیا کہ گیتا کی تعلیم انجیل ہی کی تعلیم ہے۔ حالانکہ ان کو یہ اس وقت

Marfat.com

معلوم نہ تھا کہ گیتا کا زمانہ انجیل سے بہت پہلے کا ہے۔ (اس بیان کی تفصیل کے لئے دیکھئے بال گنگا دھر تلک کی گیتا راسیا جلد دوئم باب گیتا اور عیسائیت) اور پھر یہ بھی کہا گیا کہ قرآن کریم کی تعلیم انجیل اور تورات سے لی ہوئی ہے۔

"ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!"

اب ہم اس باب کو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی صاحب کے بیان پر ختم کرتے ہیں جو ہمیں قصص القرآن میں نظر پڑا ہے۔ چونکہ اس میں چند امثال نقل کلمہ سے متعلق ہیں لہٰذا ذیل میں درج ہے۔ موصوف فرماتے ہیں :-

"بنظر تحقیق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ ناموں کے متعلق اس قسم کا اختلاف ہے جو عموماً مختلف زبانوں میں منتقل ہو جانے کی وجہ سے کتابت کی تصحیف و تبدیل کی شکل میں پیش آتا رہتا ہے۔ یعنی تورات کا عوض اور عرب مورخین کا موض اور اسی طرح تورات کا زارح ہے اور مورخین کا زارح دونوں ایک ہی ہیں۔"

یہ اقتباس ہم نے حضرت ایوب علیہ السلام کے بیان سے لیا ہے جہاں مولانا ایوباب اور ایوب کے ناموں میں یگانگت ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی نقل بھی مسلم ہے۔

Marfat.com

باب (۴) چہارم

مَلِک طاؤس

گذشتہ صفحات میں ہم نے میتانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کردوں کا بھی ذکر کیا تھا۔ تاریخی نگاہ سے کرد ایک نہایت اہم قوم ہے۔ کیونکہ قدیم قوموں کے بچے کھچے آثار اب انہی میں ملتے ہیں۔ اور یہ اب بھی اُن علاقے میں بستے ہیں جہاں زمانہ گذشتہ میں ان کا مسکن تھا۔ نہایت جنگجو۔ دلیر اور مہمان نواز قوم ہیں۔ یہ قوم زیادہ تر عراق کے شمال اور شمالِ مغرب میں آباد ہے۔ اور مختلف المذاہب ہے۔ چنانچہ ان میں اکثریت شافعی مسلمانوں کی ہے۔ تقریباً پچیس ہزار ۲۵۰۰۰ یزیدی یعنی (آتش پرست طاؤسی) ہیں۔ اور کچھ نصرانی، یہودی ان میں بہت کم تعداد میں ہیں۔

ہم اس باب میں یزیدیوں ہی کا ذکر کریں گے۔ اور اس ضمن میں کرد من حیث الجماعت کا بھی ذکر آجائے گا۔

ہم ۱۹۲۳ء کے وسط میں موصل میں تھے۔ اکثر اس کے گرد و نواح میں جانے کا اتفاق ہوتا تھا چار پانچ ماہ کی رہائش اور سیاحت کے بعد موصل کے تمام لیواؤں (صوبوں) کے قائم مقاموں (گورنروں) سے آشنا ہو چکے تھے۔ اور ہم بلا تکلف ان آزاد قبائل کے علاقوں میں گھومتے رہتے۔ ہمیں سب سے زیادہ جن افراد سے اُنس تھا۔ وہ یہی یزیدی تھے۔ ایک تو تاریخی لحاظ سے یہ قوم

Marfat.com

بہت دلچسپ تھی - دوسرے ان کی مہماں نوازی نے ہمیں کلیتہً محصور کرلیا تھا۔

پہلی مرتبہ جب ہمیں ان سے دلچسپی پیدا ہوئی تو ہم اردبیل میں تھے جو کہ شمالی ایران میں قفقاز کی سرحد پر ہے، وہاں ہم سے ایک یزیدی کی ملاقات ہوئی جو تعلیم یافتہ اور جدید قسم کا آدمی تھا جو کہ ایک غیر معمولی سی بات تھی - کیونکہ ان میں تعلیم بہت کم ہے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے یعنی اس کا مذہب کیا ہے - اور نہ ہی ہمیں یزیدیوں سے متعلق زیادہ معلومات تھیں۔ فقط ہندوستان میں ان کا نام سن رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے مختصر طور پر اپنی تاریخ اور مذہب سے ہمارا تعارف کروایا جس طرح عراق کے شمال اور شمال مغرب میں یہ قوم آباد ہے اسی طرح ایران کی مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ اور کچھ شمالی ایران میں بھی۔ کرد لوگ آباد ہیں۔ اس وقوع کی بنا پر ان کو عراقی، ترکی، اور ایرانی کرد کہا جاتا ہے۔ لباس تمام کا ایک ہی ہے اور زبان میں بھی چنداں تفاوت نہیں۔ اصل زبان کردی ہے۔ مگر جس سرحد کے قریب ہوتے ہیں اس کے الفاظ زیادہ بولے جاتے ہیں جیسے عراقی کردی میں عربی کثرت سے بولی جاتی ہے اور ترکی کردی میں ترکی زیادہ رائج ہے اپنی زبان کے علاوہ یہ اپنی سرحد کی زبان بھی بولتے ہیں یعنی عربی، ترکی اور فارسی - ایک مقام پر ہم نے دیکھا کہ کرد تین زبانیں بھی بول سکتا ہے۔ یہ علاقہ عراق کا شمال ہے - جہاں عراق اور ایران کی سرحد ملتی ہے۔ یہاں پر مقام شقلاوہ میں ہمیں ایک خاندان سے تعارف کروایا گیا جو متمول تھا۔ چونکہ یہ ایران اور عراق کی سرحد پر رہتے تھے لہٰذا دونوں زبانیں جانتے تھے علاوہ کردی کے اسی خاندان کے ایک فرد شیخ جمیل بک، نوجوان اور تعلیم یافتہ تھے - اور حال ہی میں بغداد یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لے کر آئے تھے، اس لئے فرنچ تو بخوبی جانتے تھے اور انگریزی بھی اچھی خاصی بول لیتے تھے - غالباً یہ واحد مثال تھی شریف مسلمان کردی خاندانوں میں۔ ورنہ تعلیم بہت کم ہے۔

کرد اکثر وادیوں میں رہتے ہیں جو کہ نہایت سرسبز اور شاداب ہوتی ہیں۔ اگرچہ اکثر مقام جہاں خشک پہاڑ ہوتے ہیں وہاں بھی ان کا مسکن ہم نے دیکھا ہے۔ تاہم یہ وہاں بھی ضرور باغات لگا لیتے ہیں مگر میوں کے موسم میں یہاں ہوا خوب چلتی ہے اور بارش کم ہوتی ہے۔ لہٰذا تمام کرد گھروں سے نکل کر باغوں میں رہتے ہیں۔ بانس کھڑے کرکے اس پر پتوں سے چھت ڈال لیتے ہیں اور وہیں تمام موسم گرما رہائش رکھتے ہیں۔ سردیوں میں جب برف شروع ہوتی ہے تو گھروں کے اندر چلے جاتے ہیں۔

چنانچہ اس کُرد یزیدی کے بیان سے، جو ہمیں اربیل میں ملا، یزیدیوں سے دلچسپی پیدا ہوگئی، اور ہم نے کچھ کتابیں بھی ان کے متعلق دیکھیں مگر تسلی نہ ہوئی، ہر ایک میں سطحی معلومات درج تھیں، البتہ ایک کتاب جو ہمیں اتفاقاً مل گئی اس میں سے ہمیں بہت کچھ معلومات حاصل ہوئیں اور بعد میں ہمیں اس سے سیر و سیاحت میں بہت مدد ملی یہ کتاب سر ہنری لے یارڈ (SIR HENRY LAYARD M.P.) کی لکھی تھی اور اب عرصہ ہوا ناپید ہے۔ ہماری دانست میں یہ سب سے پہلی اور مستند کتاب ہے جو انگریزی زبان میں شائع ہوئی، اس کی اہمیت زیادہ اس لئے اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ سر لے یارڈ نے نینوا اور خورس آباد میں خود عمل تنقیب کیا اور جا بجا اس کتاب میں ان آثار قدیمہ کے متعلق تفصیل موجود ہے، عمارات کے خاکے اور نقشے بھی متعدد موجود ہیں۔

مگر جو معلومات اور لطف ہمیں اُن سے باہم اختلاط کے بعد حاصل ہوا۔ وہ کتابوں سے میسر نہ ہوا۔ چند مصنفین نے یزیدیوں کا ذکر کیا ہے مگر ان کے بیانات بہت حد تک درست نہیں ہیں۔ غالباً اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ کردستان کا تمام علاقہ غیروں کے لئے قدغن ہے۔ ایک تو راستے بہت دشوار گذار ہیں، اور سڑکیں بھی اچھی نہیں ملتیں۔ دوسرے ان کے کارنامے ہی کچھ ایسے ہیں کہ اجنبی ان علاقوں سے پرہیز کرتے ہیں، اور جب بھی کبھی کسی کو کردستان جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ تو وہ دور ہی سے اس کا مطالعہ کرتا ہے جو بہت ہی سطحی ہوتا ہے۔

جب ہم چند کتابیں کردوں اور یزیدیوں سے متعلق پڑھ چکے تو ہمیں ان کے مشہور مقامات سے واقفیت ہوگئی اور ان کے راہ و رسم کا بھی پتہ چل گیا۔ اب خیال کو دا کہ ان تمام علاقوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اکثر مقامات قریب تھے۔ چنانچہ جب اکتوبر ۱۹۴۳ء میں ہم ماتر ندران سے موصل پہنچے تو ایک ایک کرکے یہ علاقے دیکھنا شروع کردیئے جہاں تک یزیدیوں کا تعلق تھا، تو ان کا ایک مقام نہایت اہم تھا۔ جس کو ہم نے سب سے پہلے دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ ایک مقدس مقام ہے اور اس جگہ ہر سال یزیدی حج (یاترہ) کو جاتے ہیں

اور خوب رونق ہوتی ہے۔

یہ مقام شیخ عدیؒ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پر پہنچنے کے لئے راستہ بہت دشوار اور کٹھن ہے۔ یہ یزیدیوں کا سب سے زیادہ مقدس مقام ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم نے اسی کا رخ کیا۔ ہم نے بہت سی اطلاعات اس مقام کے متعلق اپنے عراقی دوستوں سے حاصل کر لی تھیں۔ مگر کوئی بھی وہاں جانے کی ہمت نہ باندھتا تھا۔ کیونکہ غیر یزیدیوں کے لئے یہ مقام قطعاً ممنوع تھا۔ حیرت کا مقام ہے کہ مسلمان بزرگ کا مقبرہ اور پھر مسلمانوں ہی کے لئے قدغن اور پھر وہ بھی عراقی مملکت میں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے! ہم اس علاقے کا نقشہ اگلے صفحہ پر پیش کرتے ہیں:- (اگلا صفحہ ملاحظہ ہو)

لے ہم پہلے ہندوستانی تھے جو اس مقام پر پہنچے۔ یہ بات ہمیں بعد میں عین سفنی کے قائم مقام سے معلوم ہوئی۔ ان کے دفتر میں آنے جانے والوں کے مکمل کاغذات عرصہ دراز سے وہاں موجود ہیں۔ ہم سے پہلے صرف تین شخص مختلف ممالک سے اُدھر گئے۔ ایک تو سر ہنری لے یارڈ تھے اور دوسرے فرانس کے مشہور ماہر آثریات مسٹر بوتا (BOTA) تیسرے ایک ملٹری افسر تھا جو جنگ عظیم اول کے دوران میں وہاں گئے۔ ہمارے وہاں جانے کے بعد آخر ۱۹۴۳ء میں دو انگریز افسر بھی وہاں گئے اور انھوں نے بہت سے فوٹو بھی لئے۔ ہمیں ان فوٹوؤں کو دیکھنے کا اتفاق وہ ایک انگریزی اخباروں میں ہوا۔ مگر ان میں کچھ علمی مواد نہ تھا۔ محض ایک سفر کا بیان تھا۔

Marfat.com

نقشہ

Marfat.com

درحقیقت وجہ یہ تھی کہ عربوں اور کردوں میں بہت عرصہ سے ایک کشمکش چلی آرہی تھی، اور ہر کرد کے لئے غیر کردی عرب تھا۔ اور خاصکر جہاں یزیدیوں کا تعلق ہو۔ وہ اس رویہ میں اور بھی تیز ہوتے تھے۔

کرد خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی یا یزیدی، حد درجہ کے مہمان نواز ہوتے ہیں یہیں انکی اس خصلت کا تجربہ ہوا۔ خیر۔ ہم نے شیخ عدی کا عزم کیا۔ یہ موصل سے شمال مغرب کی طرف تقریباً ۴۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ عین سفنی تک جو کہ ۲۳ میل ہے۔ موٹر چلی جاتی ہے، باقی گھوڑوں اور خچروں کا راستہ ہے مگر بہت دشوار گذار۔ اکثر مقامات پر گھوڑے سے بھی اترنا پڑتا ہے۔ موٹر کا راستہ جبلِ مقلوب کے ساتھ ساتھ جاتا ہے عین سفنی تک درحقیقت جبل مقلوب کا سلسلہ کئی حصوں میں بٹا ہوا ہے جیسا کہ نقشہ سے ظاہر ہے۔ یہ سلسلہ کوہ ترکستان کی سرحد سے تقریباً ساٹھ میل پر ختم ہو جاتا ہے۔ سرحد ترکستان اور اختتام جبل مقلوب کے درمیان جسقدر مقامات ہیں وہاں یزیدی بکثرت ملتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی آبادی اسی علاقے میں ہے۔ اس کی محض وجہ شیخ عدی کا قرب ہے۔ شیخ عدی ایک قسم کا یزیدی ہیڈ کوارٹر ہے۔ عین سفنی جو شیخ عدی کے راستے میں پڑاؤ ہے ہم وہاں پہنچے۔ یہ ایک مختصر مگر خوبصورت مقام ہے جو پست پہاڑوں پر واقع ہے اس علاقہ کے متعلق یہاں یہ مشہور ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب کشتی بنائی تو وہ اسی جگہ پر تیار کی گئی۔ اور یہاں ہی ایک چشمہ ہے جس میں طوفان آگیا اور تمام گرد و نواح میں پھیل گیا۔ چشمہ اب بھی موجود ہے۔ اسی چشمے کی وجہ سے اس جگہ کو عین سفنی کہا جاتا ہے! ہم اس مقام کے متعلق مزید گفتگو آئندہ باب میں کریں گے۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

جب ہم عین سفنی پہنچے تو یہاں کے قائم مقام محمد قاسم بک سے ہمارا تعارف ہوا۔ یہ کیفری کے ایک معزز شافعی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور حال ہی میں ان کا تقرر عین سفنی میں ہوا تھا۔ اس سے پیشتر یہ کرکوک لیوا کے قائم مقام تھے۔ نووارد ہونے کی وجہ سے ابھی انھوں نے اپنے تمام علاقہ کا دورہ نہیں کیا تھا جو سرکاری لحاظ سے بھی ضروری تھا۔ سیر و سیاحت کا شگفتہ مذاق

رکھتے تھے، نوجوان تھے اور تعلیم یافتہ بھی۔ بغداد یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی تھی اور شیخ جمیل بک کے ہم جماعت تھے جن کا ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں۔ اس تعارف نے ہماری واقفیت قاسم بک کے ساتھ اور مستحکم بنا دی۔ قاسم بک نہایت خوش طبع اور مہماں نواز تھے۔ ہم نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے ہمارے ارادے پر لبیک کہتے ہوئے فرمایا کہ کیا ابھی چلنے کا ارادہ ہے؟ تو چلئے! ہم نے معافی چاہی۔ اس دن تو مشکل تھا۔ دراصل ہم تو صرف انتظام کی خاطر آئے تھے کہ اگر کچھ بندوبست ہو جائے تو پھر آئیں گے۔ مگر قاسم صاحب بہت مصر تھے کہ نہیں آپ یہاں رہئیے اور میں پورا انتظام کر لوں گا۔

بمشکل ان کو سمجھایا کہ بھائی یہ سرکاری معاملہ ہے اور پھر ہم فوجی ہیں، ہمارے یہاں اکثر پابندیاں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ بسا اوقات خود طبیعت کو کوفت ہونے لگجاتی ہے۔ آج رات ہم باہر گذارنے کی اجازت نہیں لے کر آئے۔ کل پھر حاضر ہو جائیں گے اور تین روز کی رخصت لے کر آئیں گے تاکہ تسلی کے ساتھ سیر کی جائے۔ چنانچہ ان کی مہماں نوازی کا شکریہ ادا کر کے ہم واپس موصل لوٹے۔

اگلے ہی روز ہم تین دن کی رخصت لے کر عین سفنی پہنچے۔ قاسم صاحب نے بہت آؤ بھگت کی سفر کا پورا پورا انتظام کر رکھا تھا، ہم نے اپنی موٹر ان کے ملازموں کے حوالے کی اور خود ان کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ ہمارے ساتھ چار مسلح عراقی سپاہی اور چھ یزیدی شیوخ تھے۔ دو ہرکارے پہلے ہی سے قاسم صاحب نے شیخ عدی روانہ کئے ہوئے تھے، تاکہ قائم مقام کی آمد کی اطلاع پہنچا دیں اور مناسب انتظام بھی کر لیں۔ قائم مقام کا عہدہ ہمارے یہاں کے گورنر کے برابر ہوتا ہے۔ اگرچہ علاقہ اتنا بڑا نہیں ہوتا اور نہ ہی تنخواہ ہی اتنی زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم جو عزت ایک قائم مقام کی وہاں ہوتی ہے وہ یہاں کے گورنروں کی بھی نہیں ہوتی!

چنانچہ چھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک وادی میں پہنچے جس کے تین طرف پہاڑ تھے، درختوں سے ڈھکی ہوئی درمیان میں وادی تھی اور ایک مختصر سا دریا رواں تھا۔ دور چوٹیوں پر برف بھی نظر آتی تھی۔ اسی وادی کے درمیان ہمیں دور سے دو سفید مخروطی عمارتیں نظر پڑیں۔ پوچھنے سے معلوم ہوا کہ یہی

Marfat.com

مقبرہ شیخ عدی ہے اور ان کے ارد گرد جو مکانات نظر آرہے ہیں یہی بستی شیخ عدی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم شیخ عدی کے مقبرہ کے متعلق کچھ عرض کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب شیخ سے متعلق کچھ تفصیل کے ساتھ ان کے حالات درج کر دیئے جائیں۔ اگرچہ ہمارے موضوع "تاریخ قدیم" کے ساتھ ان کا کچھ تعلق نہیں تاہم انکی شخصیت ایک ایسے گروہ کے ساتھ وابستہ ہے جن کی تہذیب اور مذہبی عقائد ہم آئندہ بیان کرنے والے ہیں۔ اس لئے اس گروہ کی بنیاد اسی بزرگ و بابرکت ہستی کے حالات پر لکھنا مناسب ہوگی۔ آپ کا اسم مبارک شیخ عدی بن سافر دمشقی ہے۔ اور آپ یزید بن معاویہ کے خاندان میں سے تھے۔ آپ کا آنا ادھر کیسے ہوا۔ ہم ذیل میں اپنی معلومات درج کرتے ہیں۔

واقعہ کربلا سے پیشتر کردوں کے اس گروہ کو جو آج کل یزیدی کہلاتے ہیں۔ یزواری کہا جاتا تھا (یہ حقیقت ہمیں قائم مقام عین سفنی کے کتب خانہ سے معلوم ہوئی۔ جہاں ان گروہوں کی مکمل تاریخ موجود ہے) مگر اب تک شائع نہیں ہوئی۔ البتہ عراق ڈائرکٹری IRAQ DIRECTORY مطبوعہ بغداد سنہ ۱۹۲۷ء میں کچھ تفصیل ان سے متعلق ملتی ہے۔ یہ ڈائرکٹری بھی کچھ عرصہ سے ناپید ہو چکی ہے کیونکہ اس کے بعد دوبارہ شائع نہیں ہوئی۔ خوش قسمتی سے ایک نسخہ ہمارے ہاتھ موصل کے ایک کتب خانہ سے لگ گیا) یہ ایک بالکل وحشی اور جاہل قوم تھی اور عراق کے شمال مغرب کے اطراف میں کوہستانوں کے اندر بکھری ہوئی تھی، مگر نہایت جنگجو اور دلیر تھی۔ اس وقت یہ آتش پرست ہیں اور ابلیس کی بھی پوجا کرتے ہیں۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اوّل اوّل ان پر زردشتی مذہب کا[1] اثر ہوا ہوگا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب یہ یزواری نام سے مشہور تھے۔ اوّلین آرین گروہ بھی جو اس طرف سے ہلالِ خصیب کو بڑھے۔ آتش پرست تھے۔ مگر ان میں آہورمزد کی جگہ آشور اور

---

[1] اس ضمن میں نامناسب نہ ہوگا کہ ذکر کر دیا جائے کہ زردشت کی تعلیم بھی درحقیقت وحدانیت ہی پر مبنی تھی اور اس تعلیم میں بعد ازاں انحراف واقعہ ہو گیا تھا۔ اس امر کی تصدیق ہو چکی ہے۔ حال ہی میں ہماری نگاہ سے ایک رسالہ بعنوان "پیک مزدیستان" بہ زبان فارسی گذرا ہے جو کہ دینشاہ ایرانی کا لکھا ہوا ہے اور بمبئی کا (باقی صفحہ ۱۱۵ پر)

ورونا دیوتا تھے۔ چنانچہ اب تو مورخین نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ آہورا اور آشور ایک ہی نام ہیں جو محض نقل کلمہ کی وجہ مختلف معلوم ہونے لگ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اس وقت آرین کا ایک اور بھی دیوتا موجود تھا۔ جس کو متھرا (MITHRA .) کہکر پکارا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ تین دیوتا آشور۔ ورونا اور متھرا آج کل بھی ہندوستان میں ہندوؤں میں پرستش کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک دیوتا ان کا اندر بھی ہے۔ دوسرے موصل اور کرکوک کے گردونواح میں جو نفت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۴ کا) طبع شدہ ہے۔ اس میں ایک مقام پر موصوف فرماتے ہیں "اشو زردشت تعلیم می دہد کہ مرکز جمیع کائنات و مبداء تمام موجودات اہورامزدای قادر مطلق است، ارادۂ او منکر عظیمی است کہ کشتی حیات بشری را درمیان امواج دریائے طوفانی زندگانی نگاہداشتہ و باوجود آں ہرگز بیم غرق شدن نیست"۔ ایک اور مقام پر موصوف رقمطراز ہیں "آشو زردشت برائے اشخاص معمولی کہ کمتر از حقائق آگاہ میباشند یک دستور سادہ وسہل الفہم آوردہ کہ درفہم آں محتاج ہیچگونہ کمک خارجی نخواہد شد و آں تعلیم سادہ و مختصری است کہ او سہ کلمہ اساس و اصول مذہب زردشت (پندار نیک، گفتار نیک، کردار نیک) محتوی است" اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ زردشتی عقائد کے متعلق یہ تین کلمے لوازم ایمان زردشتیاں ہیں۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ جب تک ایک قادر مطلق پر ایمان نہ ہو۔ ان تینوں کلموں کا پورا اترنا بڑا مشکل ہے۔ انکا تعلق مکافات کے ساتھ ہے اور مکافات کا احساس اسی میں ہو سکتا ہے جس کا ایمان اللہ تعالےٰ کی ہستی میں ہو خواہ وہ اسے کسی ہی نام سے منسوب کرے۔ ایک اور مقام پر اس رسالہ میں ہے۔ "در اوستا آمدہ است۔ اگر شخصی بخواہد وجدان را پاک نماید، ہیچ غسل مفید واقع نگردد۔ جز آنکہ بوسیلہ ایں سہ کلمہ جمیع مفاسد اخلاقی را از خود دور سازد" زردشتی عقائد کی اور بھی وضاحت ذیل کے اقتباس سے ہو جائے گی "اشو زردشت میفرماید، اہورامزدای یکتا دارای شش صفات است و آنہا را شش امشاسپندان نام نہادہ بمعنی "مقدس جاودانی" از اینقرار:۔

صفت ـــ اشاوہیشتا۔ راستی و درستی و پیشرفت عالم کائنات

Marfat.com

کے کنوؤں سے آگ جاری رہتی ہے ان کے شعلے ایک عجیب منظر رکھتے ہیں۔ انسانی ذہن جب شروع شروع میں ایسے مناظر سے دوچار ہوا تو ان مناظر کی پرستش کرنے لگا۔ بہرحال ہمارا یہی خیال ہے کہ بزواری زردشتی ہی تھے۔ آج کل بھی ان کے آتشکدے (FIRE TEMPLES) کہیں کہیں ملتے ہیں۔

واقعہ کربلا کے وقت یزید بن معاویہ کو سپاہیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ عام روایات کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۵ کا) صفت — وہومنو ، نہاد پاک

صفت - وہوخشترا - اقتدار مقدس وسلطنت آسمانی ۔

صفت - سپنتاآرمیتی ، عشق ومحبت وتواضع واطاعت بخداوخلق

صفت - ہروتات - کمال دریں جہاں ۔

صفت - امرتات - جاودانی وبے مرگی ۔ "

پھران صفات کی تشریح کرتے ہوئے موصوف کہتے ہیں ۔ (اشاوہیشتا) کہ معنی آں بسیار مفصل می باشد ویکے از معانی متعدد ش قانون تغییر ناپذیر وجاودانی است کہ نہ فقط زندگانی بشر بلکہ جمیع کائنات را بسوے یک مقصد کلی میکشاند ودر واقع معنی نمود ارتقاء موجودات وسیر کائنات مطابق قانون طبیعت بطرف کمال در کلمہ اشاوہیشتا جمع است "

یہاں ایک نہایت لطیف نکتہ موصوف نے بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ انگریزی شاعر ٹینسن (TENNYSON) کے چند اشعار کی طرف اشارہ کرواکر یہ بتایا ہے کہ یہ تعلیم زردشت ہی تھی اور اس شاعر نے اسی سے مستعار لی ہے ! ہم اس شاعر کے اشعار ذیل میں لکھتے ہیں اور پھر اس کے بعد بیشاہ صاحب کا رسالہ سے اقتباس دیں گے ۔ شعر یہ ہیں :-

That God who always lives and loves

One God, one Law, one element ,

مطابق جو اس وقت تمام کردستان میں مشہور ہیں۔ یہی بات رائج ہے، کہ یزید بن معاویہ کی سلمان فوجوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے اہل وعیال پر حملہ کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ان یزواریوں کو پہاڑوں سے گھیر کر لایا گیا اور ان کو معقول تنخواہیں دے کر حضرت امام حسین علیہ السلام کے خلاف لڑوایا گیا۔ اس واقعہ کربلا کے بعد ان یزواری کردوں کا نام یزیدی پڑ گیا۔ اس تحقیق پر عراق کے علماء کا اتفاق ہے۔ البتہ وہ نہیں بتا سکتے کہ یزیدی کہلانے سے پیشتر یہ کون تھے؟

اب ان کردوں کا تعلق نصرانیوں اور مسلمانوں سے ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ان دو مذاہب کے زیر اثر اپنے عقائد میں ترمیم کرنا شروع کر دی۔ کوشش یہی رہی کہ دونوں کی مشترکہ روایات کو اپنا لیا جائے۔ آتش پرستی ان میں پیشتر ہی سے تھی۔ جب انھوں نے ابلیس والا قصہ انجیل اور قرآن کریم سے سنا تو ان کو بہت پسند آیا۔ آتش پرستی کی وجہ سے ان کو ابلیس سے بھی اُنس ہو گیا، اور انھوں نے ابلیس کو اپنا خدا بنا لیا اور اس کی تعظیم و تکریم شروع کر دی۔ تمام صفاتِ الٰہی کو بھی اس کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ تعظیم کی یہ حد ہے کہ شیطان اور ابلیس کا لفظ سخت ممنوع ہے۔ ایک یزیدی کسی حالت میں بھی یہ دو نام نہیں لے گا۔ اس کا انھوں نے دوسرا ہی نام تجویز کر رکھا ہے جو اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۶ کا) *And one far off divine Event*

To which the whole creation moves."

موصوف کہتے ہیں: "بعد از ہزاراں سال کہ ایں خیال بتوسط آشو زردشت در جہاں منتشر گردیدہ اینک شاعر معروف انگلیس "تینسن" (TENNYSON) در یکے از اشعارش ایں فلسفۂ عالی را ایں طور بیاں می کند۔

"خداوندے کہ جاوداں و مہربان است۔ یک خدا ایک قانون۔ یک مادہ اصلئہ۔ یک مقصد دور جاودانی، کہ جنبش ہمہ موجودات بسوئے آنست۔"

اس نوٹ سے یہ بات قارئینِ کرام کے سامنے واضح ہو گئی ہو گی کہ زردشتی تعلیم بھی قریب قریب وہی عالمگیر تعلیم تھی، جو انبیاءِ کرام وقتاً فوقتاً لاتے رہے۔

Marfat.com

وقت ہم نے اپنے اس باب کا عنوان قرار دیا ہے۔ یعنی "ملک طاؤس"!

واقعہ کربلا کے بعد مسلمان بادشاہوں کا یہ طریقہ رہا کہ وہ اپنا ایک نمائندہ کردستان میں کچھ مقرر کردہ میعاد کے لئے بھیجا کرتے تھے جو حکومت کی طرف سے ان پر قانون نافذ کرتا۔ اور ٹیکس وصول کرتا۔ یہ نمائندہ ایک قسم کا گورنر ہوتا تھا۔ ان نمائندوں میں سے ایک نمائندہ عدی ابن مسافر الدمشقی بھی تھے۔ آپ بہت پکے مسلمان تھے اور تصوف میں آپ کو کمال حاصل تھا یزیدیوں کو آپ سے بے حد اُنس ہو گیا۔ یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ جب بھی کبھی آپ کچھ عرصہ کے لئے غیر حاضر ہو جاتے تو یزیدی پریشان نظر آتے۔ چنانچہ ایک روز سب نے مل کر التجا کی کہ آپ کا ہمارے درمیان سے چلا جانا بہت گراں گزرتا ہے، یہاں تک کہ آپ حج کو بھی جاتے ہیں تو ہم بہت پریشان اور اُداس رہتے ہیں۔ ہم آپ کے لئے ایک کعبہ اور زمزم یہاں ہی بنا دیتے ہیں آپ حج کو تشریف نہ لے جایا کیجئے! چنانچہ انھوں نے ایک چشمہ بنایا جس کا نام انھوں نے زمزم رکھا اور ایک سیاہ پتھر کہیں سے اٹھا کر لے آئے اور اس کا نام حجرِ اسود رکھ دیا!!

تاریخ اس کے متعلق خاموش ہے کہ شیخ عدی نے ان کی خواہش کو قبول کیا یا رد کر دیا۔ البتہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ آپ چونکہ پکے مسلمان تھے کسی طرح بھی یہ خواہش قبول نہ کر سکتے تھے؟ تاہم یہ دونوں چیزیں اس وقت ان کے مقبرے کے قریب موجود ہیں!۔

چشمہ کا پانی نہایت صاف اور خوش ذائقہ ہے۔ رسماً ہمیں بھی اس سے منہ دھونا پڑا اور تھوڑا پینا بھی پڑا۔ کیونکہ یہ رسم ادا کئے بغیر مقبرہ کے اندر داخل ہونا ناممکن تھا۔ اس چشمہ سے ایک نہر کاٹ کر حضرت شیخ عدی کے حجرہ کے اندر لے جائی گئی تھی۔ جہاں ایک مختصر سا تالاب موجود ہے اور تالاب کے کنارے ہی ایک مربع شکل کا سیاہ پتھر بھی رکھا ہے، حجرہ کے اندر اس قدر اندھیرا ہے کہ کچھ نظر نہیں پڑتا اس لئے پتھر کی رنگت معلوم نہ ہو سکی اگرچہ بجلی کی بتی ہمارے پاس تھی۔ تاہم پتھر پر اسقدر سرسوں کا تیل گرا ہوا تھا کہ اس کا رنگ تمیز کرنا مشکل تھا۔ حج کے دنوں میں یہاں بہت سے چراغ جلائے جاتے ہیں۔ تمام حجرہ سے تیل کی بو آ رہی تھی۔

ایک کونے میں دو چراغ بھی جل رہے تھے ۔ مگر حج کے وقت چراغوں کا ایک ہجوم بن جاتا ہے ۔ یہاں ایک چراغ تمام سال جلتا رہتا ہے اور اس کی آگ کبھی نہیں بجھائی جاتی ۔ پھر حج پر آنے والے اسی سے اپنے چراغ جلاتے ہیں اور پھر انھیں اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں ۔ ہماری عقل میں یہ بات نہ آسکی کہ اس کا کیا فائدہ ہے ۔ چراغ زیادہ دُور نہیں جاسکتا ۔ فوراً بجھ جاتا ہے اور پھر اتنا فاصلہ اسے کیسے محفوظ رکھا جاسکتا ہے ؟ مقبرہ کے اندر داخل ہونے سے پیشتر دروازے کی داہنی چوکھٹ پر ایک سانپ کی تصویر بنی ہوئی ہے ۔ یہ حضرت ملک طاؤس ہیں یہ تصویر پتھر کے اوپر تراشی ہوئی ہے ۔ انجیل کے بیان کے مطابق ابلیس کو سانپ کی صورت دے رکھی ہے ۔

ہم اس مقبرہ پر دور و نزدیک رہے ۔ گرد و نواح میں بہت سے غار تھے ، جو حج کے دنوں میں بطور مہمان خانوں کے استعمال کئے جاتے تھے ۔ اور کچھ جدید عمارتیں بھی تھیں جو رؤسا کے لئے استعمال ہوتی تھیں آج کل اگرچہ عراقی حکومت کا قائم مقام شیخ عدّی کے قریب ہی رہتا ہے ۔ تاہم شیخ عدّی بن مسافر الدمشقی کے خاندان سے بھی ایک شیخ بطور سردار کے ہر وقت وہاں رہتا ہے ۔ آج کل کے موجودہ یزیدیوں کے امیر سعید بک بن علی بک ایک معمر بزرگ ہیں اور وہاں قریب ہی ایک مقام پر جس کا نام بیداری ہے ۔ مقیم ہیں ۔ مگر اب نہ وہ عزّت ہے اور نہ وہ شان و شوکت ۔ آپ حضرت امیر معاویہ کے خاندان کے آخری فرد ہیں ۔ آپ کی اولاد کوئی نہیں ۔ گویا یہ سلسلہ اب ان کے بعد ختم ہو جائے گا ۔ ہماری ملاقات ان سے دو تین مرتبہ ہوئی ۔

اب یزیدیوں کے اعتقادات کے متعلق کچھ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا ۔ ہم کہہ آئے ہیں کہ یہ آتش پرست ہیں اور ابلیس کی تعظیم کرتے ہیں ۔ ان کا ایک مختصر سا قرآن یا مذہبی کتاب سمجھئے ہے ۔ مگر یزیدی اسے پڑھتے بہت کم ہیں ۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عدّی بن مسافر الدمشقی نے ان کے لئے کچھ قرآنی آیات کا ترجمہ کردی زبان میں کر دیا ۔ مگر اس کا بیشتر حصہ علاوہ قرآنی آیات کے لغو اور بیہودہ ہے ۔ بہت حد تک یہ چیز نایاب ہے ۔ کیونکہ شائع نہیں کروائی گئی ۔ جہاں کہیں

بھی کوئی نسخہ ملتا ہے وہ ہاتھ سے ہی لکھا ہوتا ہے۔ سر ہنری لے یارڈ نے کچھ اقتباس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کے لئے ان کی کتاب بابل اور نینوا دیکھنا چاہیئے۔ یہ لوگ دن میں تین بار نماز پڑھتے ہیں۔ مگر ان کے اوقات وہی ہیں جن میں نماز پڑھنے سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے۔ ابلیس کو یہ خدا مانتے ہیں یزیدی کہتے ہیں کہ ابلیس[1] خدا کا دوست تھا! اور دونوں نے مل کر یہ زمین و آسمان بنائے ہیں۔ مگر کسی وجہ سے دونوں میں اختلاف ہو گیا۔ ابلیس کمزور تھا اس لئے اس کو خوار کر دیا گیا۔ اس قسم کے اور بہت سے من گھڑت قصے مشہور ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی یزیدی کو بھی اپنے مذہب سے متعلق کچھ علم نہیں۔ لطف یہ ہے کہ جب قسم کھائیں گے تو خدا ہی کی کھائیں گے خیر یہ تو اب غیر شعوری طور پر مذہب میں عام ہو گیا ہے۔ ان میں تعلیم یافتہ بہت کم لوگ ہیں۔ اس سے متعلق ہم کچھ آگے عرض کریں گے۔

ملک طاؤس کی تاریخ بھی دلچسپ ہے۔ درحقیقت یہ ابلیس کا مجسمہ ہے۔ اس کی ساخت تانبے سے ہوئی ہے۔ ملک طاؤس غالباً ابلیس کو اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ فرشتوں میں ایک برگزیدہ فرشتہ تھا۔ اس مجسمہ کی شکل مختلف مصنفوں نے مختلف بتائی ہے، ہماری نگاہ میں یہ تمام نقشے غلط ہیں ایک دو کتابوں میں ان کا فوٹو دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے، اور چند مصنف یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ

---

[1] یعنی اللہ تعالےٰ آدمیوں، مویشیوں، جانوروں، اور نور کا خالق ہے، اور ابلیس درندوں، بچھوؤں سانپوں اور ظلمت کا خالق ہے۔ یہ اعتقاد زنادقہ کا بھی تھا اور ہمارا خیال ہے کہ زنادقہ کا بھی کچھ اثر ان پر پڑا ہوگا۔ چنانچہ کلبی کا قول نقل کرتے ہوئے مجدد اعظم شیخ الاسلام تقی الدین حضرت امام ابن تیمیہؒ تفسیر سورۂ اخلاص میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ وجعلوا للہ شرکاء الجن وخلقھم و خرقوا لہ بنین وبنات بغیر علم۔ علم زنادقہ ہی کے حق میں نازل ہوئی۔ کیونکہ زنادقہ اللہ تعالےٰ اور ابلیس کو باہم تخلیق کا شریک مانتے ہیں۔

ولا حول ولا قوۃ الا باللہ

Marfat.com

مجسمہ انگلستان میں بھی ایک دو شائقین انطیق کے پاس موجود ہیں جو انھوں نے بغداد میں خرید کیا ہوگا۔ ہمیں اس سے کلام نہیں۔ قارئین کرام جب اس مجسمے کی کہانی ابھی ذیل میں سنیں گے تو خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس کو حاصل کرنا کسقدر مشکل ہے۔ درحقیقت جب اوّل اوّل ماہرینِ آثارِ قدیمہ ہلالِ خصیب میں پہنچے اور انھوں نے وہاں عملِ تنقیب شروع کیا تو عوام میں بھی آثارِ قدیمہ سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ غیر ملکوں کے لوگ ایسی اشیا حاصل کرنے کے لئے بہت روپیہ خرچ کرتے ہیں، تو انھوں نے یہ پیشہ اختیار کرلیا کہ چند اہم چیزیں نقلی بنالیں! اور ان کا کاروبار شروع کردیا۔ چنانچہ آج کل بھی آپ کو بغداد اور موصل میں متعدد اس قسم کے انطیق فروش ملیں گے۔ نہ ہی صرف یہ بلکہ جس قدیم آثار پر آپ جائیں گے وہاں آپ کو جو بھی چوکیدار ملے گا اس کے پاس ضرور کچھ نہ کچھ دکھانے کے لئے ہوگا جس کے متعلق وہ یہی کہے گا کہ صاحب کل اتفاقاً یہاں کھومتے کھومتے مل گیا۔ ابھی اس کی کسی کو خبر تک نہیں۔ یقیناً آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ اسے فوراً خرید لینا چاہیئے۔ پیشتر یہ کہ کوئی حاکم اس سے چھین لے۔ چنانچہ جو قیمت وہ کہے گا آپ اکثر اسی پر خریدنے کے لئے آمادہ ہوجائیں گے! ہمیں اکثر اس بات کا تجربہ ہوا ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کسی نے ملک طاؤس بھی نقلی گھڑ لیا ہو! اور انگلستان سے کوئی آیا اور خرید کر لے گیا!!

اس مجسمہ کی تصویر کھینچنی تو درکنار اس کو نگاہ بھر کر دیکھنا بھی محال ہے۔ کیونکہ یزیدی اس مجسمے کو کبھی بھی غیر یزیدی کے سامنے نہیں لائے گا۔ اوّل تو اس کا پتہ نہیں کہ اسے لے کر کہاں کہاں گھوم رہے ہیں۔ اور اگر اتفاق سے پتہ بھی چل جائے اور کسی واقف پر دباؤ ڈال کر اسے مجبور کیا جائے تو وہ دور ہی سے جھلک دکھا کر لے جاتا ہے۔ ملک طاؤس کے چند جو مجسمے ہیں وہ حج کے دنوں میں سب شیخ عدی اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ پھر یزیدی علاقے میں ایک ہوتا ہے اور حج کے بعد پھر جو محافظ ہوتے ہیں ملک طاؤس کے اور جنکو قوّال کہا جاتا ہے وہ ان کو لے کر واپس یزیدی علاقوں میں چلے جاتے ہیں جہاں یزیدی ان کی زیارت کے لئے آتے رہتے ہیں اور ہر وقت ایک جمگھٹ رہتا ہے ہمیں خود ایک دفعہ دیکھنے کا اتفاق ہوا مگر بہت ہی قلیل عرصہ کے لئے۔ اور پھر محض دور سے دیکھنے

سے اس کی ساخت کا اندازہ کب ہو سکتا ہے؟ مگر چونکہ ہم نے پیشتر ہی سے اس کی تصاویر دیکھ رکھی تھیں اس لئے ساخت کے سمجھنے میں دقت پیش نہ آئی، کئی موقعوں پر ہم نے یزیدیوں سے اس کی ساخت کی تفصیل بھی پوچھی۔ ہمارے پاس اس کا فوٹو موجود نہیں ہے۔ مگر جو کچھ ہم نے دیکھا وہ ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

تقریباً دو فٹ لمبا۔ تانبے کا بنا ہوا ایک بجلی کے لیمپ (TABLE LAMP) کی مانند مجسمہ ہے۔ خاصکر اس لیمپ کی مانند جو کشمیر میں پیپر ماشی کام سے بنتے ہیں۔ اُن سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے چھ حصے ہیں اور ہر حصہ دوسرے سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔ تمام حصے پیچوں (SCREWS) سے جُڑے ہوئے ہیں۔ سب سے اوپر ایک جانور کی تصویر ہے جو مور (طاؤس) کی مانند ہے۔ غالباً ان لوگوں نے مور کبھی دیکھا نہیں کیونکہ مشابہت بہت کم ہے۔ تصور سے کام لینا پڑتا ہے! سب سے نیچے اس کا پیندا (BASE) ہے جس پر یہ مجسمہ کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلا شخص جس نے تفصیل کے ساتھ ملک طاؤس کے مجسمہ پر انگریزی زبان میں لکھا۔ وہ سر ہنری لے یارڈ تھا۔ اس کا ذکر ہمیں ان کی کتاب بابل اور نینوا میں ملتا ہے۔ انھوں نے بھی جو خاکہ ملک طاؤس کا بنا رکھا ہے کسی حد تک غلط ہے۔ انھوں نے بجائے چھ حصوں کے پانچ دکھائے ہیں۔ ممکن ہے کہ انھوں نے جو دیکھا ہو اس کے پانچ ہی حصے ہوں اور یہ مجسمے مختلف ساخت رکھتے ہوں۔ مگر ہم نے یہ تمام تصویریں یزیدیوں کو دکھا کر اس بات کی تصدیق کر لی تھی، اور ان کے بیان کے مطابق ہم نے ایک شکل خود بھی تیار کی اور اس کی تصدیق اس وقت کی جب تھوڑی دیر کے لئے ہمیں ملک طاؤس کا مجسمہ دکھایا گیا۔

اب رہی یہ بات کہ یہ مجسمہ کب بنا؟ اور کیوں بنا؟ اس کے متعلق تاریخ خاموش ہے۔

اور تمام یزیدی بھی لاعلم ہیں۔ قصے کہانیاں بکثرت موجود ہیں، کوئی کہتا ہے یہ آسمانوں سے اترا، اور کوئی کہتا ہے کہ یہ بخت نصر[۱] NABUCHADNAZZAR کے زمانے سے چلا آتا ہے۔ مگر یہ سب باتیں ہمارے نزدیک غلط ہیں مجسمہ کی ساخت بنا رہی ہے

[۱] بخت نصر (NABUCHADNAZZAR.) یا نبوکد نصر، اس کا زمانہ تقریباً سنہ ۱۱۴۰ء قبل مسیح کا ہے۔ یہ بابل ملوک کے چوتھے خاندان سے تھا اور آشور ریش۔ ایش (ASHUR-RESH-ISHI) جو کہ تغلتھ پلیسر (TIGHLATH-PILESER.) کا والد تھا یہ اس کا ہمعصر تھا۔ بابل کے علاوہ اسکی رامید معانی بہت وسیع تھی عیلام (ELAM.) پر اس نے قبضہ کیا اور آشور کو بھی کچھ عرصہ دبا رکھا۔ یہودیوں کو یروشلم سے نکال کر بابل کی سرزمین میں لے آیا اور ان کے طلائی و نقرئی ہیکلوں کو توڑ کر بابل کے مندروں میں استعمال کیا۔ اس قید کو کورش شاہنشاہ ایران (سائرس — CYRUS) نے توڑا اور یہودیوں کو انکے ملک لوٹایا اور ان کے دیوتا ہمین واپس دلوائے۔ کورش کا زمانہ سنہ ۵۳۹-۵۲۹ قبل مسیح ہے اور یہ ایران کا ایک نہایت رحمدل و نیک سیرت بادشاہ تھا جسکی فتوحات کی فہرست بھی وسیع ہے۔ کورش (CYRUS) زردشتی مذہب رکھتا تھا۔ کورش کی شخصیت کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے نہایت مدلل اور فصیح و بلیغ بحث ترجمان القرآن ج دویم تفسیر سورۂ کہف میں کی ہے۔ ہمارے لئے اس میں گنجائش نہیں کہ اضافہ کیا جا سکے۔ البتہ چند ایک فقرے پیک مزدیسناں سے نقل کرتے ہیں جو شاہنشاہ کورش سے متعلق ہیں۔ دینشاہ فرماتے ہیں:۔

"این بادشاہ بزرگ برعکس سلاطین قسی القلب و ظالم بابل و آشور بسیار عادل و رحیم و رؤف و مہربان بود۔ زیرا کہ اخلاق و روح ایرانی اساسش بر تعلیمات زردشت بودہ بہ ہمیں سبب کہ شاہنشاہان ہخامنش (ACHEM-ENESE —) خود را مظہر صفات "خشترائی" شمودند و ہمہ قوا و اقتدار خود را از خداوند دانستہ و آنرا برائے خیر و آسائش و سعادت جامعہ انسان صرف میکردند" یہودیوں سے متعلق ذکر کرتے ہوئے موصوف کہتے ہیں "چوں بابل را فتح نمود ہمہ خزائن غارت شدہ بنی اسرائیل را بمعبد بیت المقدس برگردانید و یہود انیرا از اسارت و پریشانی نجات داد حتیٰ فرمان داد معبد خراب ایشاں را تعمیر نمایند.... کورش بہ اندازہ با یہوداں مغلوب مدارا و عدل نعمار نمود کہ در تورات اور را مسیح موعود خواندند و من عند اللہ دانستند"

Marfat.com

کہ یہ کوئی پُرانی چیز نہیں۔ مختلف حصّوں میں جو پیچ لگے ہوئے ہیں۔ وہ بذات خود ایک جدید ایجاد ہے۔ اور پھر یزیدیوں کا ابلیس کے ساتھ وابستہ ہو جانا، واقعہ کربلا کے بعد کا قصہ ہے تو گویا یہ مجسمے کوئی پُرانی چیز نہیں اور نہ ہی یہ کہ انکی تعداد مقرر ہے۔ ہم ذیل میں ایک قصّہ بیان کرتے ہیں۔ جس سے قارئینِ کرام کو مزید اطلاع ملک طاؤس کی تاریخ کے متعلق بہم پہنچ جائیگی ہم سے یہ قصہ سنجار (SINJAR.) کے ایک یزیدی نے بیان کیا۔ کان ما کان علی اللہ تکلان

سنجار، موصل سے تقریباً اسّی میل مغرب کی طرف جبل السنجار کی وادی میں واقع ہے یزیدیوں کے کچھ گروہ جبل السنجار کے غاروں میں ابھی تک رہتے ہیں۔ ان غاروں کا ہم نے بھی ملاحظہ کیا۔ ان کی رہائش بالکل وحشیانہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک دن ایام حج میں (یہ یزیدیوں کی یاترہ ہوتی ہے جب وہ تمام شیخ عدی میں جمع ہوتے ہیں) ایک یزیدی قافلہ سنجار سے شیخ عدی روانہ ہوا۔ جب موصل کے قریب پہنچے تو ایک بدّوں کا قافلہ ان پر آن پڑا اور لوٹ کھسوٹ شروع کردی۔ انھوں نے جلدی میں ملک طاؤس کے مجسمے کو ریت میں دبا دیا کہ کہیں یہ نہ چھن جائے اور بدو اسے دیکھ پائیں جلدی میں نشان رکھنا بھول گئے۔ چنانچہ بدّوں نے ان کو خوب لوٹا اور چلتے بنے۔

ان کے جانے کے بعد جب ملک طاؤس کی تلاش شروع ہوئی تو وہ نہ ملا۔ حضرت ملک صاحب غائب تھے۔ یزیدیوں کو بہت پریشانی اور کوفت ہوئی۔ اب کریں تو کیا! حج کے موقعہ پر ان کی برادری کیا منہ دکھائے گی۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ اس ندامت سے بچنے کے لئے ایک اور مجسمہ تیار کرلیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے موصل پہنچنے سے پہلے پہلے ایک اور مجسمہ تیار کر لیا!! اور چلتے وقت سب نے ایک حسرت بھری نگاہ سے اس مقام کو آخری بار دیکھا جہاں یہ مجسمہ آناً فاناً غائب ہو گیا۔

یہ حال ہے اس کی نگرانی کا۔ اندریں حالات یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا دیکھنا کسقدر محال ہوگا۔ ہم یہ بات بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ انکی تعداد مقرر ہے اور یہ

Marfat.com

گھٹتی بڑھتی نہیں۔ اور نہ ہی یہ بات کہ یہ مجسمہ ایک قدیم چیز ہے۔ البتہ اسکی جو تعظیم یزیدی کرتے ہیں وہ ضرور قابلِ اعتراف ہے۔ مگر کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس طرح ایک تانبے کی چیز کو چھپائے پھرتے رہیں۔ کوئی خاص خوبصورت چیز بھی نہیں اور نہ ہی ہیرے جواہرات ان کو لگے ہوئے ہیں۔

دراصل یہ مجسمے سات ہیں۔ ممکن ہے ان کی تعداد ان گذشتہ سالوں میں بڑھ گئی ہو۔ یا کم ہو گئی ہو۔ جس وقت ہم شیخ عدی پہنچے وہاں ایک بھی موجود نہ تھا۔ حج کے ایام ماہ اگست میں ہوتے ہیں اور وہ ختم ہو چکا تھا۔ اور مجسمے مختلف اضلاع میں جا چکے تھے۔ ہمیں ملک طاؤس دیکھنے کا اتفاق سنجار ہی میں ہوا۔ یہ حج کے بعد کی بات ہے۔ اور ایک یزیدی نے بہت کوشش کے بعد دکھلایا۔

ایک نہایت لطیف بات ان سے اور معلوم ہوئی، اور وہ یہ تھی کہ یزیدی بھی امام مہدی کی آمد کے منتظر ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ قیامت کے نزدیک وہ ظاہر ہو کر کردی زبان میں تبلیغ کریں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نصرانیت اور اہل تشیع کا ان کی تعلیمات پر کسقدر اثر ہے۔ ہماری دانست میں وہ یقیناً اہل تشیع کی طرح علامات قیامت میں یقین رکھتے ہیں اور لفظ "لعنۃ" کی غلط تفسیر کرتے ہیں۔

کردوں کی مہمان نوازی قابلِ ذکر ہے اور ہم اس کی طرف دو تین جگہ گذشتہ صفحات میں اشارہ بھی کر چکے ہیں۔ یزیدیوں کا تو یہ خاصہ ہے۔

ایک مرتبہ یزیدی علاقے سے گذر رہا تھا جس کو باآزانی (BAAZANI) کہتے ہیں۔ یہ موصل سے عین سفنی کے راستے پر پڑتا ہے۔ یہاں ملاقات ایک یزیدی معلم سے ہوئی جو نہایت خوش طبع واقع ہوا تھا اس نے ہماری معلومات میں بھی کافی اضافہ کیا۔ یہ اس علاقے میں تن تنہا ایک ہی معلم تھا ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یزیدیوں میں تعلیم بہت کم ہے۔ اس کا الزام یہ حکومت عراق پر رکھتے ہیں نہ معلوم کیوں؟ یہ بات ظاہر ہے کہ یزیدیوں کے تعلقات حکومت عراق سے کچھ

کچھ کھنچے ہوئے ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم اول کے بعد ان علاقوں میں دو ایک بغاوتیں ہو گئی تھیں، مگر اس وقت ترکی حکومت تھی۔ آج کل یہ تمام علاقہ روسی اقتدار کے زیرِ اثر آ رہا ہے اور بغاوتیں بکثرت ہوتی رہتی ہیں۔ روس انھیں منظم کرنے کی فکر میں ہے اور بہت حد تک کامیاب بھی ہو گیا سرحدی قبائل ہونے کی وجہ سے انکی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور پھر یہ قوم عراق۔ ترکستان اور ایران کی تمام سرحدوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ جنگجو اور دلیر ہونے کی وجہ سے ان میں ضبط جلد آ گیا ہے۔ پچھلے چھ سال میں روس کا اثر ان علاقوں پر بہت رہا۔ جنوبی قفقاز سے تبریز کی طرف سب روسی قبضہ تھا۔ اور اس علاقے میں اکثریت کردوں ہی کی ہے چنانچہ روسیوں نے پہلا کام یہ کیا کہ انھیں منظم کیا تاکہ انکی آڑ لے کر اپنا اُلّو سیدھا کریں۔ کیونکہ منظم ہو کر یہ ایران۔ عراق۔ اور ترکستان کے لئے ایک خوفناک حریف بن جائے گا۔

ترکستان کے بعد جب عنان حکومت امیر فیصل کے ہاتھ آئی تو اس نے کوئی خاص توجہ انکی طرف نہ کی۔ یزیدیوں کے علاقوں میں اکثر نصرانی بھی رہتے ہیں۔ نصرانیوں کے گرجے اور مدرسے بکثرت ملتے ہیں مگر ان یزیدیوں کا کوئی بھی مدرسہ نہیں۔ ابھی تک ان میں کوئی شخص بھی ایسا پیدا نہ ہوا تھا جس نے بغداد یا بیروت کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی ہو۔ اس کے برعکس ہمیں متعدد نصرانی کرد ایسے ملے جن کے پاس لندن۔ فرانس اور بیروت کی سندیں موجود تھیں۔ کچھ ان نصرانیوں میں سے مہندس بھی تھے۔ کچھ وکیل اور کچھ ڈاکٹر بھی۔ ان بغاوتوں کے دوران میں حکومت عراق نے بہت سے یزیدی تہ تیغ کر ڈالے۔ اور اس کے بعد حکومت نے کبھی کوئی دلچسپی نہ لی۔ بازانی میں ہم سے یزیدی معلّم نے بتایا کہ اب وہ ایک مدرسہ کھولنے کی تجویز پیش کر رہے ہیں اور کچھ روپیہ بھی اکٹھا کر لیا ہے۔ یزیدی اکثر زراعت پیشہ ہیں یا بھیڑیں پالتے ہیں۔ ان کی دستکاری اونی کمبل اور قالین ہیں۔ پیداوار میں پھل بکثرت ہوتے ہیں۔ خاصکر زیتون اور انگور۔ چند علاقوں میں عرق بھی کشید کرتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی شراب ہوتی ہے۔

یہ سچ ہو یا غلط، اس حقیقت سے انکار نہیں کہ یزیدیوں میں جہالت بہت زیادہ ہے یزیدیوں کا اخلاق بہت بلند ہے۔ پردہ کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ یہ بات تمام کردوں میں پائی جاتی ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا نصرانی یا یزیدی۔ کردوں کی عورتوں میں شناخت مشکل ہے۔ کیونکہ سب سیاہ برقعوں میں ملبوس رہتی ہیں۔ اگر یزیدی عورت کسی غیر یزیدی سے شادی کرلے تو وہ ان کی مجلس سے علیحدہ کردی جاتی ہے۔ ان کے مرد خود بھی شادی باہر نہیں کرتے۔ اور نہ ہی تبلیغ کے قائل ہیں۔ چنانچہ ان کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے کچھ مسلمان بھی ہورہے ہیں۔ ان کی مہماں نوازی کا یہ حال ہے کہ اگر آپ ان کے گاؤں سے چپ چاپ نکل جائیں اور پھر ان کو پتہ چل جائے تو فوراً جو اس گاؤں کا شیخ ہوگا وہ آپ کے پیچھے آدمی بھیجکر واپس بلالے گا۔ اور کہے گا کہ میری اس میں بے عزتی ہے کہ آپ میرے گاؤں سے بغیر میرے ہاں رات کاٹے چلے جائیں۔ وہ اپنی توہین سمجھے گا اگر آپ اس کے دعوت نامے کو رد کردیں گے۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر آپ کی خاطر کرے گا۔ اور تواضع کرتے وقت یہ خیال نہیں رکھے گا کہ آپ یزیدی ہیں یا غیر یزیدی۔

ہاں، تو ہم ذکر کررہے تھے مقام شیخ عدّی کا۔ تو جب ہم وہاں سے لوٹے، راستے میں بہت سے تاریخی مقامات دیکھنے کا اتفاق ہوا جن میں سب سے اہم بادیان اور خورس آباد تھے۔ ہم ان مقامات کا مفصل حال انشاء اللہ تعالےٰ اگلے باب میں مذکور کریں گے۔ یہ تمام مقامات آشوری ہیں۔ ہم اگلا باب آشوری تہذیب و تمدن کے لئے مخصوص کردیں گے یہ موضوع بذات خود تاریخ قدیم کا ایک بہت اہم موضوع ہے۔ بعض مقامات کا ہم نے گذشتہ صفحات میں سرسری ذکر کیا ہے، ان کی بھی تاریخی اہمیت واضح کردی جائے گی۔

چنانچہ ہم ایک مرتبہ کردستان کی سیاحت کرتے کرتے، ایران کی جنوب مغربی سرحد تک جا پہنچے تو وہاں سرحد کے قریب ایک مقام رونڈوز (RAWNDUZ) تھا۔ اس سے قریب ہی کوئی پچاس میل پر اربیل کی طرف مقام شقلاوہ ہے۔ یہ حکومت عراق کا گرمیوں میں ہیڈ

Marfat.com

کوار ٹر ہوتا ہے۔ یہاں شقلاوہ کے قریب ہی ایک سلسلۂ کوہستان ہے جسکو کوہِ سفینہ کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ مشہور ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی عین سفنی سے ہوتی ہوئی یہاں آکر ٹھہر گئی۔

(ان مقامات کے لئے ملاحظہ کیجئے صفحہ ۱۱۱ پر) ہم طوفانِ نوح سے متعلق جسقدر روایات ان علاقوں میں مشہور ہیں اگلے باب میں باب کردیں گے۔

حقیقت کچھ ہی ہو اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ یہ تمام مقامات تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ہر جگہ اہم انکشاف ہو چکے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہمارا خیال ہے کہ ابھی بہت کچھ نظرِ شوق کو دیکھنا باقی ہے، اور یہ انہی علاقوں سے عنقریب برآمد ہوگا۔ ہم نے ان تمام مقامات کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے جسقدر بھی آثارِ قدیمہ کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ہم نے ان کی تاریخیں وہاں ہی بیٹھ کر پڑھی ہیں۔

ہم نے کردستان کو پرس رام (PARSURAMA TRADITION) روایت کے مطابق مدھ دیس کہا تھا۔ جب ہم عراق سے واپس لوٹے تو کچھ دیر پونہ میں قیام رہا۔ وہاں ہمیں اواخر جنوری ۱۹۴۴ء میں، ہمارے ایک کرم فرما ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے ایک رسالہ عنایت فرمایا جو مسٹر کے۔ ایم۔ منشی کا خطبۂ صدارت تھا۔ جو کہ انھوں نے ڈاکٹر سکھتنکر (SUKHTANKAR) کی وفات پر پونہ میں ۲۱ر جنوری ۱۹۴۴ء میں دیا تھا۔ ڈاکٹر سکھتنکر مہابھارت کے سب سے بڑے عالم تھے اس صدی کے میسٹر منشی اس خطبہ میں فرماتے ہیں:۔

"In Mahabherta Santiparva 49 it is stated that Brahratha was ruling in Maghdha , Saroakarma in Ayodhya , Saroabhuma in Hastinpura , Citrastha in Agna and Vasta in Kasi . Samiarma revived the fortunes

Marfat.com

of the Kurus in Madhya Desa.

His son Kuru extended his kingdom of Cedi.

"یعنی مہابھارت کے شانتی پروا ۴۹ میں بیان کیا گیا ہے کہ براہرتھ مگدھ پر حکمراں تھا سروکرما ایودھیا میں، سروکبھوما ہستن پورا میں چیتر ستھ انگا میں اور دستا کاشی میں حکمراں تھے۔ سمی ارمانے کوروں کے دن پھرا دیئے مدھ دیس میں۔ اور اس کے لڑکے کورو نے چیدی کی مملکت کو بہت بڑھا دیا۔"

ہمارے اس اقتباس دینے کا مقصد یہاں صرف اتنا ہے کہ ایکبار پھر اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ کورو مدھ دیس پر حکمراں تھے، اور یہ مدھ دیس بقول ویڈل صاحب کے کورولینڈ ہے۔ اور ہمارے نظریہ کے مطابق کورو استھان یعنی کردستان ہے۔ اور یہی کورو آج کل کرو کہلاتے ہیں۔ دیگر مقامات کے نام جو اس شانتی پروا میں لئے گئے ہیں۔ تو ان کے وقوع کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ ہم نے مدھ دیس کی طرف صرف اشارہ کیا ہے اور وہ اس لئے کہ ہمارے نزدیک یہ تاریخ قدیم میں اہمیت رکھتا ہے، ہماری نگاہ میں مہابھارت کی جنگ ہندوستان میں نہیں ہوئی بلکہ شمال مغربی عراق میں اربیلا کے میدان میں ہوئی (ARABELA) یہ میدان کردستان کی سرحد پر واقع ہے اور درحقیقت یہی میدان کورو کشیترا ہے! کئی صدیوں کے بعد اسی میدان میں سکندر اعظم اور دارا کی ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ اربیلا کا میدان اربیل سے دس میل پر موصل کی طرف کو شروع ہوتا ہے اور ایک بہت وسیع میدان ہے۔ یہاں کئی ایک جنگیں ہوئیں۔ اربیلا اربیل کے نام پر کہلاتا ہے۔ اور اربیل درحقیقت اربعہ ایلو سے بگڑ کر بنا ہوا ہے۔ مہابھارت میں جس جنگ کے متعلق ذکر ہے وہ کوروں اور پانڈوں کے درمیان ہوئی۔ جب آرین ہندوستان پہنچے تو اولین دفعہ اس کو انھوں نے تحریر میں ضبط کیا۔ اسی طرح

Marfat.com

ان کی باقی مقدس کتابیں بھی ہندوستان آکر ہی کتابی شکل میں ظاہر ہوئیں۔ بہت ممکن ہے کہ آرین کے مختلف گروہوں کی زندگی مشرق وسطیٰ میں کچھ اس قسم کی رہی ہو کہ انھیں اتنا وقت نہ ملا ہو کہ ان روایات کو اکٹھا کرتے۔ پھر جب شروع شروع میں یہ آنے شروع ہوئے تو اولین گروہوں نے اپنے مذہبی عقائد اور روایات کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا اور اس طرح ایک مکمل اور مستقل مذہب فلسفہ کی شکل اختیار کر گیا ہو۔ ویدوں اور اپنشدوں سے بھی یہ ظاہر ہے کہ ان میں جس قدر روایات اور عقائد موجود ہیں۔ وہ بیرونی ہیں، بلکہ جیسا کہ ہم تلک صاحب کی کتاب سے نقل کر چکے ہیں۔ ان کے دیوتاؤں کی صفات نہ صرف بیرونی ہیں بلکہ قطبی بھی ہیں۔

زمانہ قدیم میں تقریباً ہر بڑے شہر میں ایک دیوتا کا ہیکل بنایا جاتا تھا اور اسی دیوتا کے نام پر شہر کو منسوب کیا جاتا تھا۔ تو پھر جب ایک عقیدہ رکھنے والے گروہ ایک مقام سے نکل کر دوسری جگہ جاتے تو وہاں بھی اپنے مقامات کا نام انھیں دیوتاؤں کے ناموں پر رکھتے۔ ان ناموں میں قدرے اختلافِ زبان کی وجہ سے تبدیلی ہو جاتی مگر معنی وہی رہتے۔ چنانچہ آپ کو نہ صرف ہندوستان میں کثرت سے ایسے مقام ملیں گے جن کے نام ایک ہیں، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی ایسے نام پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان اور مشرق وسطیٰ میں کئی ایک شہر ایسے ہیں جن کا نام ایک ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آرین نے ہندوستان پہنچکر پھر دوبارہ اپنے شہروں کے وہی نام رکھ لئے ہیں جو انھوں نے ہلالِ خصیب میں رکھے تھے؟ پھر بعد میں آنیوالوں نے تھوڑی بہت تبدیلی جاری رکھی حتیٰ کہ ہم آج کل شہروں کے نام بالکل مختلف پاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب ہم اپنی بحث یزیدیوں کے متعلق تمام کرتے ہیں

یزیدیوں کے تین اضلاع کا نام ہم لے چکے ہیں۔ اب ہم ان کا آخری ضلع یہاں بیان کرتے ہیں:۔

یہ علاقہ وسط آرمینیا (CENTRAL ARMAENIA) میں ہے

ہمیں یہاں جانے کا اتفاق اکتوبر ۱۹۴۲ء میں ہوا۔ مگر اس وقت ان لوگوں سے کچھ دلچسپی نہ

Marfat.com

تھی۔ تاہم اب نظر دوڑا کر دیکھتے ہیں تو ان میں دیگر یزیدیوں کے ساتھ ایک یگانگت محسوس ہوتی ہے۔ کچھ یزیدی ہمیں اردبیل میں بھی ملے۔ یہ جنوبی قفقاز میں ایرانی مملکت کا آخری شہر ہے اور کیپ بندر پہلوی کے گرد و نواح پھونیل میں ہے دراصل ہمیں پہلی مرتبہ یزیدیوں کے متعلق اطلاعات اردبیل ہی میں ملی۔ اس وقت تک ہمارا ایمی شمالی عراق میں گذر نہیں ہوا تھا۔ اردبیل ہی کے ایک یزیدی نے ہمیں بتلایا کہ ان کے ہم مذہب لوگ بلوچستان اور سندھ میں بھی موجود ہیں۔ بلوچوں اور سندھیوں کے متعلق یہ واقعی امر ہے کہ کہ متعدد ان میں کرد ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان میں یزیدی بھی ہیں۔ تو اسے ہم تصدیق نہیں کر سکے۔ ۱۹۴۷ء کے وسط ہمیں کوئٹہ، بوستان اور چمن جانے کا اتفاق ہوا، مگر وہاں ان کا کچھ پتہ چل نہ سکا۔ ہماری نگاہ میں بلوچی کرد اور سندھی ہور۔ دونوں آرین اقوام کی نسلیں ہیں جو پہلی مرتبہ میڈیا میں پہنچیں اور جن کو بعد میں میتانی کہا گیا۔ یہی میتانی ہوری بنے، اور اُر اور لاہور کی بنیادیں رکھیں اور اب وادیٔ سندھ میں ہوروں۔ (HURS) کے نام سے مشہور ہیں۔ آج بھی ان کے دلیرانہ کارنامے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔

Marfat.com

(۵) پانچواں باب

تہذیب و تمدنِ آشور

چند مقامات پر ہم قومِ آشور کا ذکر کر آئے ہیں۔ چونکہ یہ قوم اپنی تہذیب اور تاریخ کے لحاظ سے بہت اہم ہے اور اس کے متعلق بہت سے تاریخی پہلو بھی سامنے آچکے ہیں، ہم اب یہ آخری باب اسی قوم کی تفصیل کے لئے وقف کرتے ہیں:۔

آشور کی مملکت (KINGDOM OF ASSYRIA) کی تاریخ تقریباً ۳۰۰۰ (تین ہزار سال) قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ علاقہ آشور (ASSYRIA) ہلالِ خصیب کے شمال میں، دریائے ذاب خورد (LESSER ZAB) کے دہانے تک محدود تھا۔ اس مملکت کا جنوبی حصہ دریائے ذاب بزرگ (GREATER ZAB) اور دریائے ذاب خورد کے دہانوں سے لے کر دریائے دجلہ تک پہنچ جاتا تھا۔ اس علاقے کا شمالی حصہ زیادہ تر پہاڑی ہے کہیں کہیں سطح مرتفع بھی ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں اکثر وادیاں بھی ملتی ہیں اور یہ وادیاں اکثر مقامات پر زرخیز ہیں۔ یہاں کی زمین کاشتکاری کے لئے نہایت موزوں ہے۔ دریاؤں کے کناروں کے ساتھ کا علاقہ اکثر زرخیز ہے مشہور شاہراہیں جو ایران

Marfat.com

کردستان، لبنان، اور عراق کو ملاتی ہیں اسی علاقے سے ہو کر گذرتی ہیں۔ اس کے جنوب مشرق میں ایک وسیع میدان ہے جس کے ایک طرف کرکوک (KIRKUK) اور دوسری جانب موصل (MOSUL) ہے۔ اس میدان کے تقریباً وسط میں اربیل (ARBIL) واقع ہے۔ اس میدان کا زیادہ حصہ اربیل اور موصل کے درمیان واقع ہے۔ یہی میدان اربیل ہے جس کا ہم گذشتہ باب میں ذکر کر آئے ہیں کہ یہاں پانڈوں اور کوروں کے درمیان جنگ مہابھارت ہوئی اور بعد میں سکندر اعظم اور دارا کے درمیان جنگ اربیلا ہوئی[1] (نقشہ صفحہ ۱۱۱ پر ملاحظہ ہو)

[1] لفظ اربیل سے متعلق ہم پچھلے باب کے آخر میں اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ اربعہ ایلو سے بنا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے متعلق اپنی مکمل تحقیق پیش کر دی جائے۔

اس شہر کا نام ہمیں اوّل اوّل اُر (UR) کے تیسرے خاندان شاہی کے کتبوں میں ملتا ہے۔ ان کتبات میں اسکو اُربلم (URBILLUM) لکھا ہوا ہے، اس خاندان کے بعد جب آشوری مملکت میں یہ مقام شامل ہو گیا تو ان لوگوں نے اس نام میں معانی تلاش کرنا شروع کئے۔ بالآخر انہوں نے اپنی زبان کے مطابق اس کا نام اربعہ ایلو (ARABA-ILU) لکھ دیا۔ اس کا مطلب چہار دیوتا یعنی (FOUR DEITIES) ہے۔ اربعہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی "چار" ہیں۔ اور ایلو (ILU) آشوری زبان میں دیوتا کو کہتے ہیں۔ ہمارا ذاتی فکر ہے کہ یہی لفظ بعد میں ایلو یا ہ (ILOHA) اور پھر اللہ (ALLAH) بن گیا۔ اب یہی لفظ اربعہ ایلو بدلتے بدلتے اربیل بن گیا ہے اور یہی لفظ آج تک مستعمل ہے۔ یہ ایک نہایت لطیف مثال ہے۔ نقل الکلمہ کی۔ اور اس بات کی مفصل تشریح ہم اسی عنوان کے تحت پیچھے کر آئے ہیں۔

اس بات کی طرف بھی یہاں اشارہ کر دینا نامناسب نہ ہوگا، کہ اربیل ہی فقط ایک قدیم ترین شہر دنیا میں ایسا ہے جو زمانہ قدیم سے متواتر آباد چلا آیا ہے اور کبھی تباہ و برباد نہیں ہوا۔ اس کے ہمعصر شہر دمشق اور بیروت ہیں مگر وہ کئی بار تباہ ہو کر دوبارہ تعمیر ہو چکے ہیں۔ یہ فخر صرف اربیل ہی کو حاصل ہے کہ کبھی تباہ نہیں ہوا۔

Marfat.com

ان دریاؤں میں ماہ اپریل سے طغیانیاں آنا شروع ہوتی ہیں۔ موسم سرما میں اس علاقہ کا تمام پہاڑی سلسلہ اور کچھ میدانی بھی برف سے ڈھک جاتا ہے اور یہ برف اپریل کے آخر تک پگھلنی شروع ہو جاتی ہے۔ ان طغیانیوں کی وجہ سے یہ علاقہ اور بھی زرخیز رہتا ہے۔ ذابین کوہستان کے پہاڑوں سے نکل کر آتے ہیں اور یہ وہی دریا ہیں جن کے ساتھ ساتھ اولین آرین گروہ ہلالِ خصیب میں وارد ہوئے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جب ایک قوم دوسری پر دھاوا بولتی ہے تو اکثر یہ پہاڑی مقاموں سے اترتی ہے۔ غالباً اس لئے کہ پہاڑی علاقوں کے باشندے طاقتور اور جفاکش ہوتے ہیں۔ تاریخ جس زمانے میں ہمیں آرین کے ورود کا پتہ دیتی ہے، تو اس وقت یہاں کے آثار ایک مخلوط آبادی ظاہر کرتے ہیں۔ اس علاقے میں (PALOELITHIC AGE) کے آثار بھی بکثرت ملتے ہیں۔ ڈیرہ زور (DAIR- AZ- ZOR) کے علاقے میں تو متعدد ہتھیار بھی دستیاب ہو چکے ہیں۔ نینوا (NINEVAH) اور آشور (ASSUR) میں بھی اس قسم کی آبادیوں کے بے شمار آثار ملے ہیں۔ اس علاقے سے جو اشیاء برآمد ہوئی ہیں ان کی مشابہت اُر (UR) سے برآمد شدہ چیزوں سے بہت ہے۔ اُر (UR) سے زیادہ تر ہتھیار اور برتن ملے ہیں۔ جن کا زمانہ ۲۹۰۰ سال قبل مسیح تصور کیا جاتا ہے۔ علاقہ آشور کی تہذیب میں اولین انسانی تہذیب کے بھی نشانات پائے جاتے ہیں چنانچہ مصوّر برتن (PAINTED POTTERY) اکثر مقامات پر ملے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ زمانہ آج سے ۳۵۰۰ سال قبل مسیح تھا۔ اس زمانہ کے بعد جب انسان نے دھاتوں کا استعمال ایجاد کیا تو مٹی کے برتنوں کی صنعت معدوم ہونا شروع ہو گئی۔ آشور سے برآمد شدہ اشیاء میں ہتھیار بکثرت ہیں اس لئے تصور کیا جاتا ہے کہ یہاں کی تہذیب کا وقت تقریباً ۳۰۰۰ سال قبل مسیح ہوگا۔ اور یہ جو مصوّری برتن برآمد ہوئے ہیں تو یہ یہاں کی صنعت نہیں۔ غالباً یہ بیرونِ آشور کی تہذیب کا اثر ہوگا۔ ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ آشوری تہذیب کا وقت ۳۵۰۰ سال قبل مسیح تک نہیں پہنچتا، اس تہذیب کا وقت ۲۷۰۰ - ۳۰۰۰ سال قبل مسیح کے

مابین ثابت ہے۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ اس وقفہ کی وجہ نامکمل عملِ تنقیب ہو! ابھی بہت سے قدیم مقامات یہاں پر دبے پڑے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس وقفے کے پیدا ہو جانے کی ایک اور بھی اہم وجہ ہے، اور وہ یہ کہ جب سنچرب (SENNACHERIB) نے نینوا (NINE-VAH) کو دوبارہ تعمیر کروایا، تو اس نے نینوا کی اصل بنیاد پر ایک بہت وسیع چبوترہ تعمیر کروایا۔ ممکن ہے وہ تمام تہذیب جو پرانی تھی اور اس وقفہ سے تعلق رکھتی تھی اس چبوترے کے نیچے دب گئی ہو۔ اور ابتک پوشیدہ ہو۔ اس چبوترے کو ابھی تک مکمل طور سے صاف نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ ابھی متعدد ٹیلے (MOUNDS) اس علاقے میں اور موجود ہیں جنکو ماہرین نے ابھی چھو آنک نہیں۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد ترکی حکومت نے یہاں کھدائی ممنوع قرار دیدی تھی۔ بعض علاقوں میں تو بالکل کھدائی بند ہو گئی — اور ان مقاموں پر جہاں جاری رکھی گئی وہاں تھوڑا بہت کام ہوا۔ مگر وہ بھی ابھی نامکمل ہے۔

یورپ میں ہلالِ خصیب کی تاریخ سے متعلق جسقدر معلومات بہم پہنچیں وہ تمام کی تمام انجیل سے اخذ شدہ تھیں یا بعد میں کچھ ان لوگوں کے ذریعہ جو انیسویں صدی کے شروع میں اس طرف بطور سیاحت گئے۔ ان اطلاعات نے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک نئی ریسرچ کی لہر دوڑا دی اور وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ بذریعہ عملِ تنقیب ان تمام حکایات کو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے دوران میں ماہرین کا ایک سیلاب ہلالِ خصیب میں امنڈ آیا اور انھوں نے زرِ کثیر صرف کرکے یہ عملِ تنقیب شروع کر دیا جس کا ثمر ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ جن مملکتوں نے اس ریسرچ اور عمل میں حصہ لیا ان میں اوّل اوّل سب سے پیش پیش مندرجہ ذیل ممالک تھے۔ فرانس۔ انگلستان۔ اور جرمنی اور انیسویں صدی کے آخر میں امریکہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ اب ہم اُن ماہرین کی فہرست لکھدیتے ہیں جن کے سر ان تمام انکشافات کا سہرا ہے۔

Marfat.com

ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی فہرست جنہوں نے جنگ عظیم اول سے پیشتر کام کیا

نمبر شمار	نام	مقامِ عمل	زمانہ
	فرانسیسی		
۱	ایم۔ بوتا M. BOTA	نینوا، دُرشرقین	۱۸۴۲
۲	ایم وکٹر پلے M. VICTOR PLACE	دُرشرقین	۱۸۵۱
۳	فرسنل اور اوپرٹ FRESNEL & OPERT	بابل	۱۸۵۷
۴	ڈی سارسے DE SARSEC	لگش	۱۹۰۱
	انگلسی		
۵	ہنری لے یارڈ HENRY LAYARD	نمرود، نینوا	۱۸۴۵
۶	رام RASSAM	آشور	۱۸۵۲
۷	لوفٹس LOFTUS	اُروک	۱۸۵۴
۸	ٹیلر TAYLOR	اُر	۱۸۵۴
۹	رولنسن RAWLINSON	بَورسِپّا	۱۸۵۴
۱۰	جورج سمتھ GEORGE SMITH	بابل، نمرود، آشور، نینوا	۱۸۷۳
۱۱	کنگ اور تھومسن KING & THOMSON	نینوا	۱۸۸۲
۱۲	ولیس بج WALLACE BUDGE	تل دِیر	۱۹۰۱
	جرمن		
۱۳	پروفیسر کلڈیوی KOLDEWEY	تل جِیا، تِل دُرغول	۱۸۸۷
۱۴	مورس اور میئر MORRIS & MEYER		
۱۵	کلڈیوی۔ میئر، انڈری، میسنر ڈیلٹزش (DELITZSCH) اور بومگارٹن	بابل	جنگ عظیم اول کے آغاز تک

Marfat.com

نمبر شمار	نام	مقامِ عمل	زمانہ
۱۶	کلڈیوی	تل ابوحنّاب	۱۹۰۲
۱۷	کلڈیوی اور انڈری	قلعہ شرکت (آشور)	۱۹۰۳
۱۸	ہرزفلڈ (HERZFELD)	سُمرّا	جنگ عظیم اول کے آغاز تک
	امریکن		
۱۹	پروفیسر پیٹرز (PETERS)	نُفّار (NIPPUR)	۱۸۸۸
۲۰	ڈاکٹر ہینز (HAINES)		
۲۱	ہلپرچیٹ (HILPRECHT)		
۲۲	ہارپر اور بنکس HARPER & BANKS	بسمایاہ	۱۹۰۳
۲۳	پیرے شیل (PERE SCHEIL	ابُوحَبّا	۱۸۹۴
۲۴	بدری بیگ		
	ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی فہرست جنھوں نے جنگ عظیم اول کے بعد کام کیا		
	انگلیسی		
۱	ڈاکٹر تھومسن (THOMSON)	ابوشہرین، قیونجیک یعنی (نینوا)	۱۹۱۸ ۱۹۲۷-۱۹۳۳
۲	ڈاکٹر ہال (HALL)	اُر، ابوشہرین، تل العبید	۱۹۱۹
۳	ڈاکٹر وولے (WOOLLEY	اُر	۱۹۲۲-۱۹۲۴
۴	میکے (MACKEY	کیش	۱۹۲۳-۱۹۲۶
۵	میلوآن (MALLOWEN	ارپاچیا	۱۹۳۳
	فرانسیسی		
۶	ڈی جنیلا (DEGENOUILAC)	تیلو، سینکارا	۱۹۲۹-۱۹۳۴
۷	پارو PARROT		

Marfat.com

۸	واطیلین	(WATELIN)	کیش	۱۹۲۷-۱۹۳۵
	امریکانی			
۹	کیرا، فائیفر، سٹار، نوزی،			۱۹۲۵-۱۹۳۰
۱۰	واٹرمین، سلیوشیا			۱۹۲۷-۱۹۳۱
۱۱	کیرا، فرینکفورٹ		دُرشرقین	۱۹۲۹-۱۹۳۵
۱۲	فرینکفورٹ		خفاجے، تل اسمار، اشلی	۱۹۳۰-۱۹۳۵
۱۳	سپائیزر	}		
۱۴	چارلس باشی	}	تل بلا، تیپا غورا	۱۹۲۷-۱۹۳۵
۱۵	شمائڈط	(SCHMIDT)	فارا	۱۹۳۱
	جرمن			
۱۶	جوڑڈن	(JORDON)		
۱۷	ہنریخ	(HEINRICH)	وراکا	۱۹۲۸-۱۹۳۵
۱۸	نولڈیک	(NÔLDÉKE)		
۱۹	اوسکر ریوتھر	(OSCAR REUTHER)		
۲۰	کوہنیل	(KÛHNEL)	مدعبین (طاق قصری)	۱۹۲۸-۱۹۳۱
	اطالوی			
۲۱	پروفیسر فورلانی[۱]	(FORLANI)	سداواہ	۱۹۳۳

ان ماہرین کی راہ میں جو دقتیں پیش آئیں ان کا اندازہ کچھ ذیل کی مثال سے ہو سکتا ہے
شروع شروع میں جب بوتا نے کھدائی شروع کی۔ تو اس کو اجازت طلب کرتے بہت دقت پیش

[۱] یہ فہرست ہم نے عراق ڈائرکٹری (IRAQ DIRECTORY.) مطبوعہ بغداد ۱۹۳۶ء سے لی ہے۔

آئی۔ ترکی حکومت کسی طرح بھی رضامند نہ ہوتی تھی، بوتا کی نگاہ میں وہ ٹیلہ تھا، جس پر آج کل حضرت یونس علیہ السلام کا مزار واقع ہے۔ یہ ٹیلہ موصل سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ہے اور قدیم نینوا ہی کا ایک حصہ ہے۔ آج کل اسی ٹیلہ پر ایک مستقل قصبہ بھی وجود میں آچکا ہے۔ بوتا یہاں ایک اچھوتا عمل کرنا چاہتا تھا، مگر اس کی چال کارگر نہ ہوئی۔ جب اس نے دیکھا کہ حکومت ترکیہ کسی طرح بھی اجازت دینے کی خواہشمند نہیں۔ تو اس نے اس ٹیلے پر چند مکانات خرید کیے۔ یہ مکان آپس میں ملے ہوئے تھے اور ایک قسم کا کٹڑہ تھا۔ اس نے ان مکانات کے دالانوں کے اندر سے کھدائی شروع کر دی خفیہ طور سے، وہ بہت جلد اپنے اس فعل میں کامیاب ہوا۔ اس کو بہت سی سرنگیں ملیں جو سنحرب SENNACHERIB کے محلات کی طرف پہنچتی تھیں۔ ان سرنگوں میں بوتا کو چند ایک نہایت اہم کتبے ملے جو بیتوں پر لکھے ہوئے تھے، مگر بوتا کو یہ معلوم کر کے بہت پشیمانی ہوئی کہ

ایں ہمہ راز است کہ معلوم عوام است!

آناً فاناً یہ خبر حکومت ترکیہ کے مرکز تک پہنچی اور بوتا کو وہاں سے فوراً نکل جانے کا حکم مل گیا۔ پھر بوتا صاحب وہاں سے ایسے بھاگے کہ نگاہ دگر نہ کرد! ہماری دانست میں ہماری یہ بہت ہی بڑی بدقسمتی ہے کہ بوتا کو انکشافات کرنے کی اجازت نہ دی گئی، اس کی محض وجہ مذہبی تعصب تھا، لوگوں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ نصرانی حضرت یونس علیہ السلام کے مزار تک پہنچ کر ان کی ہڈیاں چرا لے جانا چاہتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے سمجھا ہو کہ شاید وہاں کوئی خزانہ ہے جس کو یہ برآمد کرنا چاہتا ہے اور انھوں نے رکاوٹ پیدا کر دی۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو ترکی حکومت خود خزانہ کا اخراج کرتی۔ مگر ایسا نہ تھا، رکاوٹ کی فقط یہی وجہ تھی کہ لوگ مذہبی تعصب کی وجہ بوتا سے بگڑ بیٹھے تھے اس روز سے آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہاں کام شروع کر سکے۔ ہماری نگاہ میں یہ جو ٹیلہ آج کل موجود ہے۔ اس کی بنیاد سنحرب (SENNACHERIB) کے کسی محل پر ہوگی۔ جنوب مشرق کی طرف سے ٹیلے کا منظر بہت دلکش ہے۔ جہاں جہاں

تازہ مٹی اکھڑ کر گرتی رہتی ہے۔ وہاں وہاں مٹی کے اندر مختلف قسم کی اینٹیں نظر آتی ہیں۔ کم از کم چھ سات مختلف قسم کی تہیں اس ٹیلے کے اندر ہم نے بھی دیکھی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر طبیعت اسقدر للچا جاتی ہے کہ یہی دل چاہتا ہے، یہاں ایک دو ہاتھ مار کر دیکھا جائے، کیا کچھ ملتا ہے۔ بس یونہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی پتھر یا مجسمے لے باہر سر نکالا۔ ٹیلے کے نیچے اب بھی بہت سی پتھر کی محرابیں اور اور دیگر مکانات کی ساختیں پڑی ہیں جو کھدائی کے وقت نکلیں، یا جو شروع سے گرد و نواح کے محلات میں موجود تھیں۔ اب ان تمام کو اکٹھا کر کے نبی یونس کے ٹیلے کے نیچے جمع کر دیا ہے، جب کوئی نیا مکان موصل میں تیار ہوتا ہے تو یہاں سے محرابیں لے جا کر مکان میں بطور چوکھٹیں مزین کی جاتی ہیں۔ موصل کے اندر بہت کم مکانات ایسے ہونگے جہاں سنحیرب (SENNACHERIB) کے محل کی محرابیں استعمال نہ ہوئی ہوں اب قارئین کرام خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ محل کس قدر بڑا ہوگا۔ اس ضمن میں ایک اور بات موصل کے متعلق نہایت دلچسپ ہے جس کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ انجیل باب یوحنا میں نینوا کی آبادی ایک لاکھ بیس ہزار یعنی (SIX SCORE THOUSAND) لکھی ہے، آجکل الموصل کی آبادی بھی تقریباً یہی ہے "موصل لیوا" جس میں تمام گرد و نواح کے علاقے شامل ہیں اور ایک صوبے کی مانند ہے، کی آبادی کلیتاً دو لاکھ پینتیس ہزار ایک سو ستتر ہے۔ اس میں سے موصل شہر کی آبادی نکال دیجئے تو باقی آبادی گرد و نواح کے علاقوں کی رہ جائے گی۔ گویا موصل کی آبادی تقریباً تقریباً وہی ہے جو آج سے ڈھائی تین ہزار برس پہلے تھی!

قلعہ شرکت یعنی آشور (ASSUR) جو مملکت آشور کا دارالخلافہ تھا۔ یہاں بھی ایک رقم کثیر کھدائی پر خرچ کی گئی مگر حسب توقع اس قدر دستیاب نہ ہو سکا کہ آشور کی قدیم تاریخ پر کچھ روشنی پڑتی۔ آشور کی بنیاد اول جب رکھی گئی تو یہ ۲۵۰۰ قبل مسیح کا زمانہ تھا۔ آج کل عراق کا محکمۂ آثارِ قدیمہ یہاں دوبارہ عمل شروع کرنا چاہتا ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ از سر نو یہ تنقیب نئے راز افشا کر دے گی۔ اور اس علاقے کی قدیم داستان مکمل

Marfat.com

ہو جائے گی۔ فی الحال اس علاقے کے متعلق جسقدر بھی روایات موجود و مشہور ہیں، اگر چہ ان میں سے اکثروں کی تصدیق نہیں ہوئی۔ تاہم یہ سب نہایت دلچسپ ہیں۔ یہاں کی تہذیب طوفانِ نوح سے بھی قدیم تصوّر کی جاتی ہے چند بادشاہوں کے نام لکھتا ہوں جو کتابِ خطِ میخی سے بھی حل ہو چکے ہیں۔ یہ بادشاہ طوفانِ نوح سے پیشتر حکمراں تھے اور ان کی راجدھانی مملکت آشور پر تھی اور انکی تعداد بعض ماہرین نے دس تک بتائی ہے۔ ایک مورخ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ ایک کلدانی تھا اور سنچرب (SENNA - CHERIB) کے زمانے میں ہوا ہے۔ ہماری دانست میں بہت ممکن ہے کہ یہ کلدانی مورخ انہی کلدانیوں میں سے ہو جن کو گرفتار کر کے بابل سے سنچرب (SENNACH - ERIB) اپنی مملکت میں غلام بنا کر لایا تھا۔ اس علاقے میں آج کل بھی کلدانیوں کی ایک تعداد کثیر موجود ہے۔ ہمیں خود بہت سے کلدانیوں سے ملنے کا اتفاق یہاں ہوا ہے پس ظاہر ہے کہ اس کلدانی مورخ نے آشور پہنچکر جو قصّے کہانیاں سنیں جو اس کی آمد سے دو ہزار سال پیشتر کے تھے۔ انھیں اس نے قلمبند کر دیا۔ ان قصّوں کا ذکر سڈنی سمتھ بھی اپنی کتاب ہسٹری آف اثریا (HISTORY OF ASSYRIA) میں کرتا ہے مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے ارض القرآن ج ۱ ص ۱۳۶ پر ایک فہرست دی ہے جس میں آپ نے طوفانِ نوح سے قبل کے بادشاہوں کی تعداد درج کی ہے۔ ہم اس فہرست کی کچھ تفصیل کرنا چاہتے ہیں درحقیقت یہ فہرست قابلِ تنقید ہے۔ مختلف ماہرین نے مختلف فہرستیں تیار کی ہیں اور یہ جو ارض القرآن میں موجود ہے، یہ انہی میں سے ایک فہرست ہے۔ طوفانِ نوح سے قبل کے بادشاہوں کی چار فہرستیں موجود ہیں۔ ان کے مندرجہ ذیل نام ہیں۔

۱۔ فہرست بروسس یہ ارض القرآن میں نقل کی گئی ہے۔ BROSUS

۲۔ فہرست لارسا ۱ LARSA-No. 1.

LARSA-NO-2 — ۳- فہرست لارسا نمبر ۲

NIPPOR — ۴- فہرست نپوّر۔

پہلی فہرست کے مطابق اس خاندان میں دس بادشاہ گذرے ہیں جنکا زمانہ حکومت مجموعی طور پر ۲۳۴,۰۰۰ سال ہے۔ دوسری فہرست کے مطابق بادشاہوں کی تعداد آٹھ ہے اور ان کا زمانہ حکومت ۲۴۱,۲۰۰ سال ہے۔ تیسری فہرست کے مطابق بادشاہوں کی تعداد پھر دس ہوگئی ہے۔ اور ان کا زمانہ حکومت ۴۵۶,۰۰۰ سال تک تصور کیا جاتا ہے، چوتھی فہرست میں بادشاہوں کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔ فقط جن مقاموں پر حکمراں تھے وہی حل ہوتے ہیں اور ان کی مدتِ حکومت کا بھی پتہ نہیں ان تمام فہرستوں میں مختلف بادشاہوں کے نام مختلف حل ہوتے ہیں۔ مگر یہ کوئی ایسا اختلاف نہیں کہ ان کی شخصیتوں کو مختلف کہا جائے۔ تلفظ میں تھوڑا اختلاف ہے۔ ارض القرآن میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے صرف انکی تعداد اور زمانۂ حکومت بتایا ہے۔ ہم اس کی تفصیل لکھتے ہیں اور ہر بادشاہ کا زمانۂ حکومت علیحدہ علیحدہ لکھتے ہیں تاکہ قارئینِ کرام پر یہ چیز اور واضح ہو جائے۔ ہم نے اس فہرست کے بنانے میں سڈنی سمتھ کی ہسٹری آف اشوریا سے مدد؎ لی ہے۔

	بادشاہوں کے نام قبل از طوفان نوح		سالِ حکومت
۱	آلوروس	ALOROS	۳۶,۰۰۰
۲	آلاپروس	ALAPAROS	۱۱,۸۰۰
۳	آلمیرون	ALMERON	۴۶,۸۰۰

؎ ہمیں خود اس گنتی کے ماننے میں تردد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جس طرح اس زمانے کے علمائے نے تکلف سے کام لیا ہے اور اپنے حکمرانوں کے عہدوں کو بہت بڑھا کر دکھایا ہے۔ فلسفۂ تاریخ اس کی تصدیق نہیں کرتا۔

Marfat.com

۴	ایمینون	AMMENON	۴۳,۲۰۰
۵	ایمیگل روس	AMEGALROS	۶۴,۸۰۰
۶	داؤناس	DAONOS	۳۶,۰۰۰
۷	یوڈوریکیس	EUEDORACHOS	۶۴,۸۰۰
۸	ایمیم سیینوس	AMEMPSINOS	۳۶,۰۰۰
۹	اوتی آرتس	OTIARTIS	۲۸,۸۰۰
۱۰	ذی سوتھروس	XISOUTHROS	۶۴,۸۰۰
	مجموعۂ سالِ حکومت		۴۳۲,۰۰۰

بہرکیف ماہرین آثار قدیمہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آشور کی تہذیب ایک قدیم تہذیب ہے اور اس کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام سے تین ہزار سال پیشتر سے شروع ہوتا ہے طوفانِ نوح کا قصہ سومیری کتبات سے بھی ثابت ہو چکا ہے۔ اس واقعہ کو وہاں گلگمیش (GILGAMESH-) کی روایت سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہی سب سے پرانی روایت اس قصے کے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ سومیری کتبات اور آسمانی صحائف کے علاوہ ہلالِ خصیب میں متعدد اقوام ایسی ہیں جن میں طوفان سے متعلق روایات ملتی ہیں، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس قصے کے ساتھ بہت سے مقامات منسوب ہو گئے ہیں اور اس وقت تک کسی ایک مقام کا تعین قطعی طور پر نہیں ہو سکا۔ ہم نے ان مقامات کا جستہ جستہ ذکر گذشتہ اوراق میں کیا ہے۔ اب ہم ان کو اس مقام پر اکٹھا کر کے لکھ دیتے ہیں تاکہ تمام نقشہ سامنے آجائے۔

ہلالِ خصیب میں تین مقام اس قصے کی وجہ سے مشہور ہیں۔

اول:۔ کوہِ سفینہ۔

دوئم:۔ عینِ سفنی۔

سوئم:۔ جبلِ سنجار۔

کوہ سفینہ اربیل کے شمال کی طرف مقام شقلاوہ کے قریب واقع ہے۔ اس کو کوہِ سفینہ (کشتی والا پہاڑ) اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ طوفانِ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی پانی پر تیرتی ہوئی اس پہاڑ کے ساتھ آکر لگ گئی تھی۔ اور یہیں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو کشتی پر سے اُتارا تھا۔

دوسرا مقام عینِ سفنی ہے۔ یہ موصل سے شمال مغرب کی طرف تقریباً ۲۷ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہیں سے راستہ شیخ عدی اور باویان (BAVIAN -) کو جاتا ہے۔ یہاں ایک چشمہ ہے، اس کے ساتھ یہ روایت منسوب ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو جب بذریعہ وحی طوفان کی خبر دی گئی اور کشتی بنانے کا حکم ملا، تو انھوں نے اسی مقام پر کشتی بنائی، اور یہ چشمہ جو اب بھی موجود ہے، اسی میں اللہ تعالےٰ کی قدرت سے طوفان آگیا اور یہ اُبل پڑا۔

تیسرا مقام جبلِ سنجار ہے۔ یہ موصل کے جنوب مغرب کی طرف تقریباً ۸۰ میل پر واقع ہے، اس پہاڑ میں اب بھی غار موجود ہیں اور ان میں یزیدیوں نے رہائش اختیار کر رکھی ہے۔ ان میں یہ قصہ مشہور ہے کہ جب عینِ سفنی میں طوفان آیا تو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی یہاں آکر اس مقام پر پہاڑ کے ساتھ رک گئی۔ یہ تینوں قصے ہمارے سننے میں انہی علاقوں میں آئے ہیں۔ کان ما کان علی اللہ تکلان۔

ہم موضوع سے دور نکلے جا رہے ہیں تاہم اس قصہ کو ختم ہی کر لینا چاہیئے۔ اسی سلسلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے۔ پچھلی صدی کے آخر میں طوفانِ نوح سے متعلق ہندوستان میں ایک بحث شروع ہوئی۔ اس بحث میں مندرجہ ذیل اصحاب شامل تھے۔ میاں محمد مظہر الحق بیرسٹرایٹ لاء مرحوم، مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی، لالہ بنا نک پرشاد چریاکوٹی تلمیذ مولانا مولوی قاضی عنایت رسول صاحب۔ یہ تمام بحث ایک رسالہ کی شکل میں ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس رسالہ کا نام "احسن البیان فی تحقیق مسئلۃ الطوفان" ہے۔ اس تمام بحث میں خطِ میخی کے کتبات سے بحث

Marfat.com

کی گئی ہے اور موضوع یہ ہے کہ طوفان عام تھا یا خاص۔ سب سے دلچسپ وہ بحث ہے جو پنڈت صاحب نے شروع کی تھی۔ اپنشدوں اور ویدوں سے یہ بات پیش کرتے ہیں کہ ہر جگ کے بعد ایک طوفان آتا رہا ہے۔ اس بات کا ہمیں اس سے پیشتر بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے مگر ہم نے اس کا ذکر یہاں اس لئے کیا ہے کہ ایک اور مقام جو ہندوستان میں واقع ہے اس کے ساتھ بھی یہی قصہ منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ مقام ریاست بیجاور کے قریب بندھیل کھنڈ میں واقع ہے اور اس کو بھیم کھنڈ کہتے ہیں۔ ہم نے اس مقام کو ۱۹۴۵ء کے وسط میں دیکھا۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جس طرح ایک کنواں ہے، مگر قریب پہنچکر معلوم ہوا کہ اس کے اندر اچھی خاصی سیڑھیاں ہیں جو تقریباً دس فٹ چوڑی ہیں اور انکی تعداد تیس چالیس کے درمیان ہوگی۔ نیچے اتر کر ایک وسیع دالان میں آتے ہیں جس کے ایک طرف غار ہیں اور دوسری جانب پہاڑ کو تراش کر کمرے بنادئے گئے ہیں۔ پھر ایک سیڑھیوں کا سلسلہ اور شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے اختتام پر ایک مختصر سا تالاب ہے۔ یہ تالاب درحقیقت ایک چشمہ ہے۔ اس تالاب کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہم نے جب اس کے کنارے پر کھڑے ہو کر نیچے کی طرف دیکھا تو اس کی سطح نظر نہیں آتی تھی۔ پانی اسقدر نیلے رنگ کا تھا کہ سمندر کا پانی بھی اتنا نیلا دیکھنے میں نہیں آیا۔ مگر نہایت شفاف تھا۔ تالاب کے دونوں جانب دو چٹانیں دور تک نیچے جاتی نظر آتی تھیں مگر یہ چٹانیں ملتی نہ تھیں اور جہانتک نظر کام کرتی تھی یہی دکھائی دیتا تھا کہ یہ چلی جاتی ہیں مگر ملتی نہیں۔ پانی کا رنگ اس امر کی دلیل ہے کہ واقعی سطح نہایت گہری ہوگی۔ اس تالاب کے عین اوپر پہاڑ کی چھت بنی ہوئی ہے۔ اور اس میں ایک بڑا سوراخ ہے۔ اس سوراخ سے روشنی اندر آکر تمام جگہ کو روشن کرتی ہے۔ اس مقام کے ساتھ ہندوؤں میں یہ قصہ مشہور ہے کہ جب پہلا طوفان آیا تھا۔ تو وہ اس جگہ سے شروع ہوا تھا، مگر یہاں کشتی والا قصہ کسی کو معلوم نہیں۔ اسی مقام کے ساتھ ایک مندر ہے اور قریب ہی ریاست کا ایک مہمان خانہ بھی ہے۔ یہ مقام ریاست چھترپور سے جو سڑک شاہ گڑھ کو جاتی ہے۔ اور اس سڑک پر جہاں یو۔ پی۔ اور سی پی کی سرحد

ملتی ہے، یہاں سے مشرق کی طرف کوئی نو میل کے فاصلے پر ہے، ایک کچا راستہ ہے اور موٹر بڑی مشکل سے جاتی ہے۔

اس مقام کو بھیم کھنڈ کیوں کہا جاتا ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ ہمارا قیاس یہ کہتا ہے کہ بادشاہ بھیم کے ساتھ اس مقام کو کوئی مناسبت ہو گی۔ کھنڈ سنسکرت میں تالاب کو کہتے ہیں اس لئے بندھیل کھنڈ اس علاقے کا نام پڑ گیا ہے۔ کیونکہ یہاں جگہ جگہ تالاب اور جھیلیں ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جس طرح تالابوں سے بندھا ہوا ہے۔

درحقیقت طوفانِ نوح سے متعلق مستشرقین نے جو علاقہ شروع میں تجویز کیا تھا وہ ارارات (ARARAT.) کا علاقہ ہے، اصل علم تو اللہ تعالےٰ ہی کی دانست میں ہے۔

اب ہم اس جملۂ معترضہ کے بعد اپنے اصلی موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

لفظ آشور کے متعلق تحقیق ہم لکھ آئے ہیں کہ آشوریوں کا (ASSYRIANS.) یہ ایک دیوتا تھا۔ اور اس کے نام پر قوم کا نام پڑا اور دارالخلافہ بھی کہلایا۔ ہمیں اس لفظ کا استعمال خطِ میخی کے کتبوں میں دو طرح سے ملتا ہے۔ ایک آشیر (ASHIR) اور دوسرے آشور (ASHUR) ابتدا میں اس لفظ کو تین معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اول شہر یا بستی کے لئے۔ دوم۔ ملک یا زمین کے لئے اور سوم۔ دیوتا کے معنوں میں سومیری زبان (SUMERIAN LANGUAGE.) میں اس لفظ کو آ۔اُسار (A-USAR) کہا جاتا تھا۔ ہمیں سامی زبان میں یہ لفظ نہیں مل سکا۔ اگر ہو، تو بہت ممکن ہے کہ یہ عبرانی (HEBREW) زبان کے لفظ آشر (ASHAR) کا مترادف ہو۔ آشوری زبان میں اس لفظ کو دو طرح سے لکھا جاتا ہے۔ رسم الخط میخی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

اول-

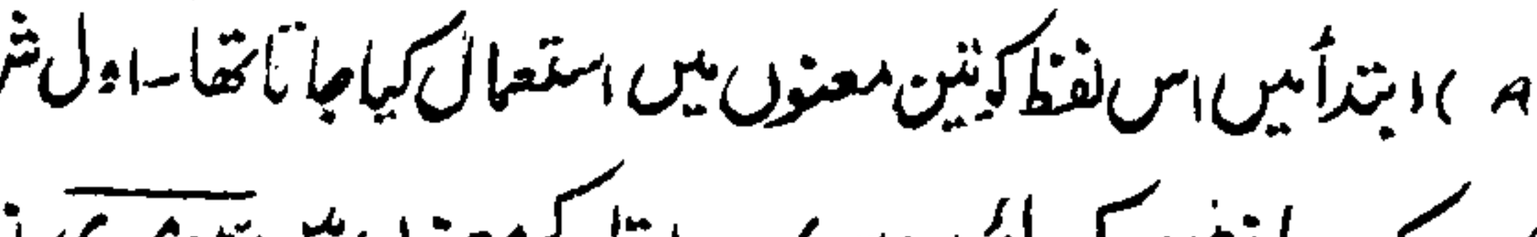

دوم-

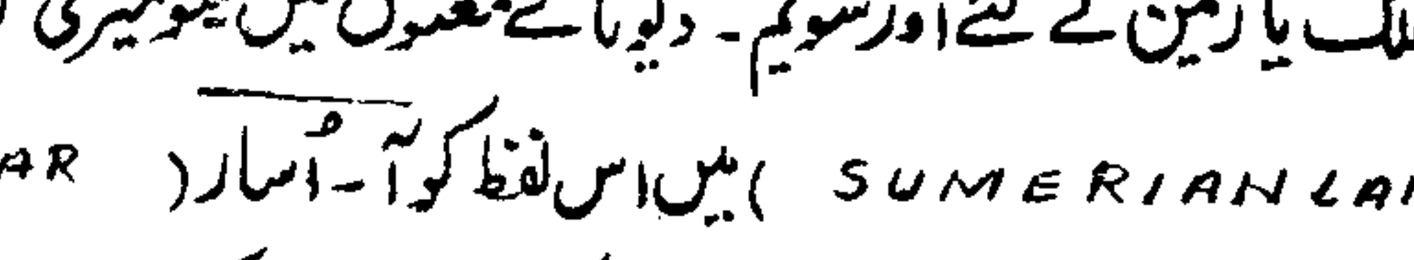

ہمیں آشیر (ASHIR) کا لفظ زیادہ موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابتدا میں یہ لفظ رحمٰن اور رحیم کے معنوں میں بھی مستعمل رہا ہے۔

آشوری قوم سے متعلق تحقیق تاریخ اس کے متعلق مختلف جواب دیتی ہے۔ ہم ذیل میں اپنی تحقیق کرتے ہیں - یہ بھی آرین کا ایک گروہ تھا۔ جو کچھ گروہوں کے گذر جانے کے بعد یہاں پہنچا۔ ان سے پیشتر وہ گروہ جو آگے چل کر سومیری کہلایا یہاں سے گذر کر جا چکا تھا اور بلادِ خصیب کے جنوب میں آباد ہو چکا تھا۔ یہ سومیری گروہ یہاں کچھ عرصہ رہ کر گیا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے کچھ آثار یہاں دستیاب ہوئے ہیں، اور غالباً جو مشابہت ماہرینِ آشوری اور سومیری تہذیبوں میں بتاتے ہیں۔ اس کی وجہ محض یہی ہے ہماری نگاہ میں یہ گروہ آرمینیا (ARMENIA) سے ہوتا ہوا کردستان (ایرانی و ترکی) پہنچا اور یہاں سے ترکستان ہوتا ہوا آشور جا کر جاگزیں ہو گیا۔ مورخین و مستشرقین یہ کہتے ہیں کہ آشوری بابلیوں کے فرمانروا تھے اور آکادی تھے۔ ہمارے نزدیک یہ غلط ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ بابلی حکومت ایک وقت بڑھتی بڑھتی آشوری مملکت تک پہنچ گئی تھی اور بہت سا حصہ قبضہ میں لے لیا تھا، مگر یہ ایک قلیل عرصہ تھا۔ بعینہٖ اسی طرح سنچرب (SENN - ACHERIB) کبھی بابل تک فتح کرتا ہوا پہنچا۔ اقوام کا یہ مدّ و جذر رہتا ہی ہے۔ مسلمان کبھی ہسپانیہ تک حکمراں تھے، مگر وہی ہیں کہ ہسپانیہ تک ہی محکوم و مجبور رہیں!! مورخین اپنے اس نظریئے کی سند انجیل سے بھی لیتے ہیں۔ چنانچہ باب پیدائش (۱۰ : ۱۱) میں مذکور ہے۔ "آشور (نمرود) بابل سے باہر چلا گیا۔ اور نینوا کی بنیاد رکھی"۔ ہماری دانست میں اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آشوری ہمیشہ ہی بابلیوں کے ماتحت رہے ہیں۔ ان کی اپنی حکومت بھی کئی صدیوں تک قائم رہی۔ ہمیں آشوری تہذیب کا بابلی تہذیب پر اثر بہت نمایاں نظر آتا ہے آکادی اور سومیری زبانوں کا بھی آشوری زبان سے دور کا تعلق نہیں۔ البتہ رسم الخط بہت ملتا ہے۔ ممکن ہے یہ رسم الخط آشور ہی میں شروع ہوا ہو۔ دو ہزار سال قبل مسیح آشوری تہذیب

اتنک ترقی کر چکی تھی کہ ہمیں یہاں سیاسی اور ادبی ادارے ملتے ہیں۔ آشوریوں کے اپنے قوانین
یں رائج تھے جن میں عورتوں کے حقوق کا باقاعدہ طور پر تحفظ کیا گیا تھا۔ ان کے وزرا اور
راء بھی سومیریوں سے زیادہ مہذب تھے۔ ان کے اپنے محل ہوتے اور محلوں میں پرائیویٹ
ئبریریاں ہوتیں۔ یہی لائبریریاں اب متعدد مقامات سے برآمد ہو چکی ہیں۔ مورخین کی ایک
ئخ نے آشوریوں کو سمیٹیک (SEMETIC) بھی ثابت کرنا چاہا ہے۔ اور یہ بات پیش کی
یہ وسطِ عرب کے باشندے ہیں۔ اس کے نظریئے کی بنا یہ تھی کہ ان کی زبان میں بہت مشابہت
ے۔ ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں اور ہم اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں لفظ اربیل کے
ت میں کر آئے ہیں۔ عربی نسل کو آشوریوں کے ساتھ راہ و رسم مدت تک رہا ہے۔ موصل جو
ات آشور کا تقریباً وسط ہے۔ اسی واسطے موصل کہلاتا ہے کہ یہاں پر تمام مشہور شاہراہیں
شام اور فلسطین سے آتی ہیں، ملتی ہیں، یہاں آمد و رفت بہت زیادہ تھی اور ان اقوام کا
لاط بھی زیادہ رہا۔ موصل عربی کے لفظ وصل سے ہے۔

اس اختلاط کی وجہ سے اکثر ایسا ہو جاتا ہے کہ ایک زبان کے لفظ دوسری زبان میں جذب
ہو جاتے ہیں۔ مگر ان دونوں کے کلچروں میں بے حد تفاوت ہے، مذاہب میں کسی قدر اختلاف
ں ہے۔ تشکل و تشابہت میں آشوری، سوریا کے آرامیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں
وہ لوگ جن کو (ARMAENS OF SYRIA) کہا جاتا ہے۔ یہ مضبوط اور
ت قد تھے۔ اور ان کے بال گھونگریالے اور سیاہ رنگ کے تھے۔ عرب لوگوں کا قد و
ت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مستشرقین کا ایک گروہ یہی کہتا ہے کہ آشوری۔ ایشیائے
ک (ASIA MINOR) اور دریائے دجلہ (TIGRIS -) کے مشرقی حصہ کے
ے تھے۔ یہ علاقہ تقریباً وہی ہے جو ابھی بالا میں ہم نے ان کے لئے تجویز کیا ہے۔ جب ان کا
ط دوسری اقوام میں ہو گیا تو انھوں نے لاتعداد شادیاں بھی ان میں کیں۔

آشوری تہذیب اور تمدن کی ایک دلچسپ مثال ان کا کیلنڈر[۱] (CALENDER

حاشیہ ملاحظہ ہو (صفحہ ۱۵۰ پر)

Marfat.com

ہے، جو انکی خود اپنی ایجاد ہے۔ ان مہینوں کے نام ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ ان کے تلفظ کے متعلق ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہوگا، اور نہ ہی کوئی اور اس بات کا دعویٰ کرسکتا ہے کہ خط میخی کے کتبوں کے حل کے وقت انکو بعینہ اسی طرح لکھا جاسکتا ہے جس طرح کہ یہ بولے جاتے تھے۔ ہماری نگاہ میں جب تک ایک زبان کو بولا نہ جائے اور سُنا جائے اس کا تلفظ معلوم کرنا ناممکن ہے۔ مہینوں کے نام یہ ہیں:۔

۱	کرآتے	QARRATE
۲	تان (؟) مارتے	TAN(?) MARTE
۳	سین	SIN
۴	کوزآلی	KUZALLI
۵	آلاناتے	ALLANTE
۶	بیلتی ایکلیم	BELTI-EKALLIM
۷	ساراتے	SARATE
۸	کینتے	KINATE
۹	موہراِتی[۲]	MOHR ILLI
۱۰	آب سرانی	ABSARANI
۱۱	ہبور	HIBBUR
۱۲	سیپیم	SIPPEM

آسمانی صحائف میں بھی اس علاقے کا ذکر مختلف پیرایوں میں ملتا ہے۔ انجیل کا باب پیدائش

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] یہ نام ہم نے سڈنی سمتھ کی ہسٹری آف اسیریا سے لئے ہیں۔

[۲] موہراتی غالباً مہراتی ہے جو حمورابی (حمورابی) کے کتبوں میں اللہ تعالیٰ کے لئے مستعمل ہے۔

Marfat.com

اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ قومِ لوط بھی اس علاقے کے ساتھ منسوب تھی۔ اس باب میں مختلف مقاموں کا ذکر ہے۔ جن میں سے ایک کو ایلاسار (ELLASAR) کہا گیا ہے۔ مورخین کہتے ہیں کہ یہ وہی مقام ہے جس کو لارسا (LARSA) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک قدیم شہر ہے جو مملکتِ آشور میں واقع تھا اس کے آثار اب جل چکے ہیں۔ انجیل کے اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ سدوم وغیرہ نے عیلام کے بادشاہ CHEDORLAOMER کی اطاعت قبول کرلی، مگر تیرہ سال کے بعد اس ملک میں ایک انقلاب برپا ہوگیا اور اس بادشاہ کو نکال دیا گیا۔ اس کی جلاوطنی کے وقت اس کے ساتھ شنار (SHINAR) کا بادشاہ بھی تھا، اور ایلاسار (ELASAR) کا حکمراں بھی ہمراہ تھا۔ جب سدوم تباہ کیا گیا تو اس وقت حضرت لوط علیہ السلام، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادر زادہ تھے، گرفتار کرلئے گئے، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت برانگیختہ ہوئے اور اپنے ساتھیوں کو لے کر اس علاقے پر دھاوا بول دیا۔ اور دشمن کو دمشق کی طرف دھکیل دیا۔ یہ بات غلط ہو یا درست اس سے ایک بات واضح ہوجاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ قومِ لوط اول مملکتِ آشور ہی میں مقیم تھی۔ اسی طرح ہمارا خیال ہے کہ قومِ عاد اور قومِ ثمود جن میں ایک عرصہ حائل ہے اور جو قومِ لوط سے بہت پہلے ہوئیں اسی مملکتِ آشور میں مقیم تھیں۔

قومِ عاد اور ثمود کے متعلق تحقیق یہ جو خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سامی اقوام سے تھیں تو یہ غلط ہے۔ ہماری نگاہ میں اس سے متعلق کوئی امر بھی قطعی طور پر فیصلہ کن ثابت نہیں ہوا۔ جو بات اس طرف اشارہ کرتی ہے وہ محض اتنی ہے کہ ان کی زبان میں متعدد عربی الفاظ ملتے ہیں مگر یہ ناکافی ہے۔ ہم نے گذشتہ اوراق میں عرض کیا ہے کہ ہلالِ خصیب میں ایک قدیم عرصہ سے مستقل حکومت تھی جس میں دو گروہ آباد تھے قرآن کریم نے ان کا نام عاد اور ثمود لیا ہے۔ قومِ ثمود۔ ہلالِ خصیب کے اس حصہ میں آباد تھی جو حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے۔ اور وادی القریٰ تک چلا گیا ہے مگر ایک زمانہ میں اس کا پھیلاؤ بابل کے جنوب سے ہوتا ہوا شہر اُر (UR) تک پہنچتا تھا۔ دوسرا علاقہ جس میں قومِ عاد آباد تھی، اس کو آرام کہا گیا ہے۔

عادِ اولیٰ اور عادِ ثانیۃ میں ایک عرصہ حائل ہے، ان دونوں کا مسکن مستشرقین نے جو بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ عاد حضر موت کے علاقے میں مقیم تھے اور ثمود وادی القریٰ میں بستی تھی۔

وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ — ثمود وہ لوگ ہیں جنہوں نے وادی قریٰ کے پہاڑوں کو تراش کر (مکان بنائے)

نیز یہ بھی فرما دیا:۔

کَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِیْنَ۔ — جھٹلایا حجر والوں نے پیغمبر کو یعنی یہ لوگ حجر کے بھی رہنے والے تھے۔

ہمیں یونانی، رومی، اور اسلامی مورخین کے بیانات میں چنداں تطابق نظر نہیں آتا، بلکہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ قصّے اور کہانیاں بیان کر دی ہیں جن میں ذاتی جستجو کا شائبہ بھی نہیں۔ البتہ قرآن کریم نے جن مقامات کا ذکر کر دیا ہے اس کے لگ بھگ انھوں نے بھی مقامات تجویز کر دیئے ہیں۔ ہمارا ذاتی فکر یہ ہے کہ یہ دونوں اقوام ان علاقوں میں محدود نہ تھیں بلکہ ایک بہت بڑے علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں جن میں وادی قریٰ اور حضر موت کے علاقے بھی شامل تھے۔ اس علاقے میں مملکتِ آشور کا ایک بڑا حصہ شامل تھا اور اس جگہ پر ان کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں اقوام ہمارے نزدیک مختلف وقتوں میں قریب قریب واقع تھیں اور ایک ہی گروہ کی دو شاخیں تھیں۔ جس طرح اکثر اقوام کی نقل و حرکت ہوتی رہتی ہے۔ یہ قومیں بھی مختلف مقاموں میں گھومتی رہتی تھیں اور بسا اوقات رہائش بھی اختیار کر لیتی تھیں۔ یہ بات کہ یہ دونوں قومیں قریب قریب واقع تھیں علامہ جرجی زیدان کے اس بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ان ارتباطھا بعاد لقصی تقاربھا بالمکان ۔ یہ بات کہ ان کا مسکن محدود تھا تو قرآن کریم اس بات کو پیش کرتے وقت خود فرماتا ہے کہ انھوں نے میدانوں اور پہاڑوں میں مکان بنائے اور تراشے کسی ایک میدان اور کسی ایک پہاڑ کا نام نہیں لیا۔ بلکہ اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ یہ اقوام کافی علاقے پر پھیلی ہوئی

Marfat.com

بھتیں۔ پھر یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ ان کا مسکن فقط وادی قرٰی اور حضر موت تک ہی ہے!! اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے :-

وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ
مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ
فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ
مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ
تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ
فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا
تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۔
(اعراف)

اور وہ وقت یاد کرو جب قوم عاد کے
بعد اللہ نے تمہیں اس کا جانشین بنایا
تھا اور اس سرزمین میں اس طرح بسا دیا
تھا کہ میدانوں سے محل بنانے کا کام لیتے
تھے اور پہاڑوں کو بھی تراش کر اپنا
گھر بنا لیتے تھے۔ پس اللہ کی نعمتیں یاد کرو
اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے خرابی
نہ پھیلاؤ۔

اس آیت سے اس بات کی وضاحت بھی ہو گئی کہ قوم ثمود مختلف میدانوں اور مختلف پہاڑوں کو رہائش کے لئے استعمال کرتی تھی بعینہٖ اسی طرح جیسے قرآن کریم نے فرما دیا ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ جہاں بھی یہ پھیلتے گئے وہاں وہاں انھوں نے میدانوں میں محل بنائے اور پہاڑوں کو تراش کر مکان بنائے۔ اور ان مقاموں میں سے تمثیلاً اللہ تعالےٰ نے ایک مقام کا ذکر کر دیا ہے۔

اب ہم ایک مقام کا ذکر کرتے ہیں۔ جہاں پہاڑوں کو تراش کر مکان بنائے گئے ہیں۔ ہم نے اس مقام[1] کا بغور خود مطالعہ کیا ہے۔ یہ مقام موصل کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کو باویان (BAVIAN) کہا جاتا ہے۔ یہ مقام مملکت آشور میں شامل تھا۔

[1] اس سے ملتا جلتا ایک اور مقام افغانستان میں بھی ہے جسے بامیان (BAMIAN) کہتے ہیں یہاں بدھ تہذیب کے آثار موجود ہیں۔ ایک بہت بڑی وادی میں ایک پرانا قصبہ ہے (باقی صفحہ ۱۵۴ پر)

Marfat.com

جب ہم اس مقام پر پہنچے تو دُور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑی چٹان دریا کے کنارے کھڑی ہے۔ اور اس میں چورس کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ دریائے ذاب خورد تھا۔ (LESSER ZAB.) اور اسی مقام پر ہی یہ پہلی مرتبہ پہاڑوں سے نکل کر میدان میں داخل ہوتا ہے۔ جب ہم قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ کمرے ہیں، مگر ان میں چڑھنے کا راستہ کوئی نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہاں پر چڑھنے کے لئے لکڑی کی سیڑھیاں استعمال ہوتی ہوں۔ اس چٹان کی اونچائی دریا کے کنارے سے تقریباً ایک سو گز ہوگی۔ چٹان کی سطح پر کمروں کے درمیان کچھ بت تراشے ہوئے تھے۔ اور ایک درجن کے قریب خط میخی کے کتبے بھی تھے۔ بت تو یقیناً بہت بعد میں تراشے گئے ہونگے البتہ کچھ کتبے جو ضرب خوردہ ہیں وہ غالباً بنیادی ہونگے، جو پڑھے جاتے ہیں ان میں سنچرب SENNA- کا ذکر ہے، اور ان کی تعداد چھ ہے، تو گویا یہ اس امر کی دلیل ہے کہ چھ کتبے سنچرب نے لکھوائے ہوں گے اور یہ جو بت تراشے ہوئے ہیں یہ بھی اس زمانے کی ساخت ہیں۔ یہ چھ کتبے جن میں سنچرب کا ذکر ہے حل ہو چکے ہیں۔ ان میں محض اس کی فتوحات کا ذکر ہے۔ بتوں اور دیگر نقش و نگار کے متعلق کبھی یہ مذکور ہے کہ یہ سنچرب کے دوسرے سال حکومت میں تراشے گئے جو باقی چھ ضرب خوردہ کتبے ہیں تو یہ ہماری دانست میں قوم ثمود نے مکان تراشتے وقت بنیادی طور پر لکھوائے ہونگے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی حالت اس قابل نہیں کہ وہ پڑھے جا سکیں۔ سنچرب کے کتبوں میں چند کلدانیوں کا ذکر موجود ہے، جو وہ بابل سے پکڑ کر لایا تھا ہم اس طرف گذشتہ صفحات میں اشارہ کر چکے ہیں۔ آج کل بھی بادیان کے گرد و نواح میں اکثر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۳ کا) جس کے ایک طرف چٹانوں میں غاریں بنائی گئی ہیں اور ان کے ایک طرف مہاتما بدھ کا تراشا ہوا مجسمہ ہے۔ یہ مجسمہ بدھ کے مجسموں میں سب سے بڑا مجسمہ ہے۔ یہ مجسمہ ابھی تک محفوظ ہے، اور کابل کے قریب ہی یہ قصبہ بامیان واقع ہے۔

Marfat.com

گلدانی ملتے ہیں۔

آشور میں تین مشہور بادشاہ گذرے ہیں جن کا تعلق ہمارے اس موضوع سے ہے ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ شمسوایلونا	SHAMSU ILUNA
۲۔ ارشیو۔دوئم	ERUSHV II
۳۔ شمسی عاد	SHAMSI AD

شمسوایلونا اور ارشیو کا زمانہ (۱۹۰۰۔۱۹۳۰۔قبل مسیح کا ہے اور شمسی عاد کا زمانہ ۱۸۰۰ — ۱۸۴۰ قبل مسیح ہے۔ان کے درمیان جو نصف صدی کا وقفہ ہے اس کے متعلق مورخین خاموش ہیں۔تاہم ان تینوں بادشاہوں کا تعلق اقوامِ عاد اور ثمود کے ساتھ ہے۔شمسی عاد (بعض ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے اس نام کا حل شمسی عاد ادبھی کیا ہے) کے والد کا نام ایریکیکاپو (ERIK-APAPO) تھا۔یہ تمام بادشاہ نسلاً آشوری تھے۔شمسی عاد کے کچھ کتبات ڈیرہ زور (DAIR AZ ZOR) میں بھی ملے ہیں۔یہ مقام دریائے فرات کے کنارے موصل کے جنوب میں واقع ہے۔ان میں اس کی فتوحات کا ذکر ہے۔چنانچہ لکھتا ہے کہ میں نے ایک بہت بڑا علاقہ فتح کیا اور اس علاقے کو اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔تل عشرہ جو ڈیرہ زور کے قریب ہی ایک مقام ہے، وہاں سے بھی اس کے کچھ کتبات برآمد ہو چکے ہیں۔ان میں بھی اکثر فتوحات ہی کا ذکر ہے۔اگر ان تینوں کو عاد اور ثمود کے بادشاہوں میں سے تصور کرلیا جائے تو یہ جو وقفہ حائل ہے اس کی پیچیدگی اس طرح حل ہو سکتی ہے کہ یہ وقفہ عادِ اولیٰ اور عادِ ثانیہ والا وقفہ ہے۔

شمسی عاد نے اپنے کتبوں میں لکھا ہے کہ میں نے شمال اور جنوب، مشرق و مغرب کے تمام ملک فتح کئے، یہاں تک کہ ساحل کے قریب پہنچ گیا۔اس کے بہت عرصہ بعد آشوربنی پال (ASHU-RBANI PAL) ایک بادشاہ گذرا جسکا وقت ۶۷۰ قبل مسیح ہے وہ بھی اپنے کتبوں اپنی

Marfat.com

فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے ساحل تک پہنچنے کا ذکر کرتا ہے۔ شمسی عاد کے کچھ عرصہ بعد تاریخ پھر خاموش ہے۔ اور ماہرین و مورخین حیرت زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور حکمران قدیم تاریخ کی اسٹیج پر آتا نظر پڑتا ہے جس کا نام کتبات میں عاد نیراری (AD NIRARI III) تھا۔ اس کا زمانہ ۱۳۷۸-۱۲۸۰ قبل مسیح ہے۔ عاد نیراری۔ عاد آسی (AD ASI) کا بیٹا تھا۔ اور اس کے دادا نے تمام بادشاہوں سے سلطنتیں چھین لی تھیں۔ ہر زمانے میں ہی کئی مرتبہ آشوری مصر میں بھی ملتے ہیں۔ مگر تاریخ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ وہاں یہ کس طرح اور کب پہنچے۔ ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق یہ محض ایک گروہ کی گردش تھی جو اس دنیا میں جاری رہتی ہے۔ آپ فی زمانہ یہودیوں ہی کی مثال لے لیجئے۔ اس جنگِ عظیم نے اس قوم کا شیرازہ بکھیر دیا اور یہ دنیا کے چپے چپے میں سرگرداں رہے۔ مگر اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ انبوہ در انبوہ فلسطین کو واپس لوٹ رہے ہیں۔ اگر انکی کوئی مخصوص تہذیب قائم ہوتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ ان کی تہذیب کے آثار امریکہ اور جرمنی میں بھی ملتے ہیں اور کچھ کوہستان میں بھی۔ کم از کم ان کے گرجے (SYNAGOGUE .) تو ان مقامات پر ضرور ملتے ہونگے اسی طرح گذشتہ اقوام کی بھی مدوجذر ہوتی رہی۔ اور اس میں چنداں تعجب کی کوئی بات ہم پہلے باب میں لکھ آئے ہیں کہ اقوام بار بار اپنے اصلی مرکز کی طرف لوٹتی رہیں جس سے یہ وابستہ ہو چکی تھیں۔ آج کل آپ یہودیوں کو اپنے اصلی مرکز کی طرف لوٹتا دیکھ رہے ہیں۔ ہم اسے اللہ تعالےٰ کا ایک قانون سمجھتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی بیرونی رکاوٹ مانع نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہو کر رہتا ہے۔ خواہ دوسروں کے لئے یہ کیسے ہی ناساعد حالات پیدا کیوں نہ کردیں چنانچہ اسی طرح گردش کرتے کرتے قوم عاد اور ثمود کبھی وادی قریٰ اور حضرموت میں پہنچ گئی اور انھوں نے وہاں عمارات تعمیر کیں اور پہاڑ تراشے۔ عاد نیراری نے ۱۲۸۰ قبل مسیح میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا لڑکا سلمان نصیر (SALMAN NESEER) تخت نشین ہوا یہ بھی اپنے دادا کے نقش قدم پر چلا اور اس کی فتوحات جاری رکھیں۔

Marfat.com

یہ جو ابھی ہم نے بالا میں طوفانِ نوح اور قومِ عاد اور ثمود کے متعلق لکھ دیا ہے تو یہ قارئینِ کرام کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ محض ہمارا ذاتی فکر اور نظریہ ہے۔ کوئی یقینی امر نہیں ہر بات قابلِ تنقید ہے کسی تاریخ میں یہ امور جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اس پیرایہ میں ذکر موجود نہیں۔ اسپر ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اور سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے علماء جدید تحقیقات کے مطابق اپنے اندر ایک نئی ریسرچ کی روح پیدا کریں تاکہ یہ تاریخِ اقوام کا معمہ حل ہو سکے۔

اب ہم اس کتاب کو قرآن کریم کے اس ارشاد پر تمام کرتے ہیں :-

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا	اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان
وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ	لے آتے اور برائیوں سے بچتے تو ہم آسمان
بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ	اور زمین کی برکتوں کے دروازے ضرور
وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ	ان پر کھول دیتے لیکن انھوں نے جھٹلایا
بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ -	پس اسکی کمائی کی وجہ سے جو انھوں نے
(اعراف-۹۴)	حاصل کی تھی ہم نے انھیں پکڑ لیا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا

Marfat.com

ضمیمۂ اوّل

شجرۂ نسب ملوکِ[1] متعلق مغربی ایشیا بابت ۱۷۶۰ سے لیکر ۱۳۴۰ قبل مسیح تک

قبل مسیح	وادیٔ مصر	وادیٔ دجلہ وفرات	ختی	بابلی	آشوری	قبل مسیح
۱۷۶۰				دمقی ایلیشو		۱۷۶۰
۱۷۵۰			ترنش		شی نینیا	۱۷۵۰
			ختوشلیش اول مور شیش پسر ترنش	کاشی	شرماعاداد دوئم	
۱۷۴۰			خنلیش	گنڈاش		۱۷۴۰
۱۷۳۰				آگوئم	اری شوم سوئم	۱۷۳۰
۱۷۲۰			زندن تاش		شمسی عاداد دوئم	۱۷۲۰
۱۷۱۰			اموناش			۱۷۱۰
۱۷۰۰			ہوزلیش	کستلاش	اشمی داغان دوئم	۱۷۰۰
۱۶۹۰						۱۶۹۰
۱۶۸۰			تلی بن اُدش		شمسی عاداد سوئم	۱۶۸۰
۱۶۷۰			آبیرآتش		آشور نیراری اول	۱۶۷۰
۱۶۶۰			کشتیلاش		پزور سن یا شمسی عاداد چہارم	۱۶۶۰
۱۶۵۰						۱۶۵۰
۱۶۴۰				تازی گرومش	پزور آشور سوئم	۱۶۴۰

[1] ماخوذ از ہسٹری آف آسیریا از سڈنی سمتھ ـ ص ۲۰۶ ـ ۲۰۷ ـ

قبل مسیح	وادیٔ مصر	وادیٔ دجلہ و فرات	ختّی	بابلی	آشوری	قبل مسیح
۱۶۳۰				پیش گلدرامش ہرباشپک		۱۶۳۰
۱۶۲۰					آنلیل ناصر اوّل	۱۶۲۰
۱۶۱۰				طیپ طکسی		۱۶۱۰
۱۶۰۰					نورالی	۱۶۰۰
۱۵۹۰						۱۵۹۰
۱۵۸۰	آہموز			اگوم پسر تازی گرومش	نامعلوم	۱۵۸۰
۱۵۷۰						۱۵۷۰
۱۵۶۰	آمن ہوتپ اوّل			نامعلوم	آشور نراری دوئم	۱۵۶۰
۱۵۵۰				بُرنا بُریاش		۱۵۵۰
۱۵۴۰	تھوتھمیز اوّل			میلام کُرکُرا	پزور آشور چہارم	۱۵۴۰
۱۵۳۰						۱۵۳۰
۱۵۲۰	تھوتھمیز دوئم			عُولم بُریاش		۱۵۲۰
۱۵۱۰					انلیل ناصر دوئم	۱۵۱۰
۱۵۰۰	تھوتھمیز سوئم					۱۵۰۰
۱۴۹۰					آشور ربی اوّل	۱۴۹۰
۱۴۸۰						۱۴۸۰
۱۴۷۰						۱۴۷۰
۱۴۶۰					آشور نراری سوئم	۱۴۶۰
۱۴۵۰	آمن ہوتپ دوئم	ہوری اور میتانی				۱۴۵۰
۱۴۴۰		شوش شتر		کرائینداش	آشور بل نشیشو	۱۴۴۰

Marfat.com

قبل مسیح	وادئی مصر	وادئی دجلہ و فرات	ختّی	بابلی	آشوری	قبل مسیح
۱۴۳۰						۱۴۳۰
۱۴۲۰	تھوتمیس چہارم	آارت آتما		کاوش من حربے	آشور رم نشیشیہ	۱۴۲۰
۱۴۱۰			دھودیش اوّل			۱۴۱۰
۱۴۰۰	آمن ہوتپ سوئم	شترنا		کوری غلزو	آشور نارین آہے	۱۴۰۰
۱۳۹۰		آرت آتما دختر تھ	شبی لو ایلو	قدشمن انلیل اوّل	حربا عادادا اوّل	۱۳۹۰
۱۳۸۰		پسر شترنا متی آرنا			آشور ابلیط	۱۳۸۰
۱۳۷۰	آمن ہوتپ چہارم			برنا بریش		۱۳۷۰
۱۳۶۰	توطن خامن		ارنو اندشش	کر انید شش		۱۳۶۰
۱۳۵۰			بیرشیش	کوری غلزو		۱۳۵۰
۱۳۴۰					انلیل نراری	۱۳۴۰

Marfat.com

ضمیمہ دوئم

شجرۂ نسب ملوک متعلق مغربی ایشیا بابت ۱۳۴۰ سے لیکر ۱۲۰۰ قبل مسیح تک

قبل مسیح	وادئ مصر	حتّی	بابلی	آشوری	قبل مسیح
۱۳۴۰	حرم حب	مورشیش دوئم	کوری غلزو		۱۳۴۰
۱۳۳۰				انلیل نراری پسر آبلیط	۱۳۳۰
۱۳۲۰				آرک دین الی	۱۳۲۰
۱۳۱۰	رمیسز اوّل (RAMESES)	مورتّلش	ناظم ارونش	عادادنراری اوّل	۱۳۱۰
۱۳۰۰					۱۳۰۰
۱۲۹۰	رمیسز دوئم (RAMESES)	ہتوشیش	قدشمن ترغو		۱۲۹۰
۱۲۸۰				شلمنسار اوّل	۱۲۸۰
۱۲۷۰			قدشمن انلیل		۱۲۷۰
۱۲۶۰			کدور انلیل		۱۲۶۰
۱۲۵۰		دودھل اش		توکلتی انورتا اول	۱۲۵۰
۱۲۴۰	مرنیتاہ		کشتی لاش		۱۲۴۰
۱۲۳۰		ارنو اندش	عادادشم ناصر		۱۲۳۰
۱۲۲۰	آمن موس			آشورندی بال	۱۲۲۰
۱۲۱۰	رمیسز سپتاہ سیتی دوئم ستنخت رمیسز سوئم	دودھل اش		آشورنراری چہارم انلیل کدورا سار	۱۲۱۰
۱۲۰۰			میلی شپک	انورتا آپل اکور	۱۲۰۰

ضمیمۂ سوئم

شجرۂ ملوک متعلق مغربی ایشیا بابت ۱۲۰۰ سے لیکر ۹۰۰ قبل مسیح تک

بابل	آشور
(کاشی)	
عاداد شم ناصر ۱۲۳۰—۱۲۰۱	انلیل کدور اُسار ۱۲۰۵—۱۲۰۱
میلی شپک دوئم ۱۲۰۰—۱۱۸۶	انُورتا آپل اکُور اوّل ۱۲۰۰—۱۱۸۸
مردُخ بلدان ۱۱۸۵—۱۱۷۲	آشوردان اوّل ۱۱۸۷—۱۱۵۰
ایل باباشمدین ۱۱۷۲-	
انلیل ندین آہے ۱۱۷۱-	
ایسن کا خاندان دوئم	
مردُوک شپک زیری ۱۱۶۸	
انورتا ندین شم	انُورتا تُوکلتی آشور
بخت نصر اوّل ۱۱۵۰—۱۱۱۰	مُتکّل نسکو پسر آشوردان اوّل
انلیل ندین اپلی ۱۱۱۰—۱۰۸۰	آشور ریش اِشی اوّل ۱۰۹۹
مردوک ندین آہے ۱۰۸۰—۱۰۶۵	طغلتھ پلیسر اوّل ۱۰۹۸—۱۰۶۸
اِتی مردوک بُلاتُو ۱۰۶۵—۱۰۶۴	انُورتا آپل اکُور دوئم ۱۰۶۷-
مردوک شپک زیرمتی ۱۰۶۴—۱۰۶۳	آشوربل کالا
عاداد آپل دین ۱۰۶۲—۱۰۴۱	عریبا عاداد دوئم
مردوک آہے عریبا ۱۰۴۰	شمسی عاداد چہارم ۱۰۴۸

Marfat.com

بابل	آشور
مُردوک زیر ۱۰۳۹—۱۰۲۸	
بنؤشم لیبئور ۱۰۲۷—۱۰۲۰	آشور نصیرپال اوّل ۱۰۴۷—۱۰۲۷
سمش شپک ۱۰۱۹—۱۰۰۲	شلمنسار دوئم ۱۰۲۵—۱۰۱۵
آیاکمین زیر ۱۰۰۲	آشور نزاری پنجم ۱۰۱۴—۱۰۰۹
کاشوندین آہے ۱۰۰۱—۹۹۹	آشور ربّی دوئم ۱۰۰۸
خاندانِ بازی	
اُلمش شکین شُم ۹۹۸—۹۸۲	
اُدرتا کدور اُسار ۹۸۱—۹۷۹	
شرقتم شقمُنا ۹۷۹	آشور ریش اشی دوئم ۹۶۴
خاندانِ عیلام	طغلتہ پلسر دوئم ۹۶۳—۹۳۳
مربیتی آپل آسار ۹۷۸—۹۷۳	آشور دان دوئم ۹۳۲—۹۱۶
آٹھواں خاندان	عاداد نزاری دوئم ۹۱۱—۸۹۹
بنؤ مکین اپلی ۹۷۲—۹۳۶	
مربتی احدین	
شمسو مُدمِق ۹۰۰	

Marfat.com

ضمیمۂ چہارم ل؎

ابتدائی فہرستِ شاہانِ سومر و آکاد

اُما، آرک اور اُر	لاگش	کش، اوپس اور آکاد	قبل مسیح
		ابی سین	
		خاندانِ اسین (۱۲۱۸)	
		اشبی آرا	۲۳۰۰
		گمل ایلیشو	۲۲۵۰
		عیدین داغان	
		اشمی داغان	
گنگنو		لبیط اِشتار	۲۲۰۰
		ارتینب	
		برسین دوئم	
		ایتر کاشا	
		اُرزامینی	۲۱۵۰
		بن اکشا	
		انلیل بنی	
		زمبیا	
سمسو ایلو		سین ماگیر	۲۱۰۰
		دمیق ایلیشو	

ل؎ یہ شجرۂ نسب تاریخ سومر اور آکاد سے لیا گیا ہے جو کہ ایل۔ ڈبلیو۔ کنگ صاحب کی تصنیف ہے۔

Marfat.com

ضمیمۂ چہارم

ابتدائی فہرستِ شاہانِ سومرو آکاد

اُما، آرک اور اُر	لاگش	کِش، اوپس اور آکاد	قبل مسیح
	اُرنینا، آکُورگل		۳۰۰۰
اُوشس	اَنّتمُ	زُوزُو	۲۹۰۰
اناکالی	انتیمینا		۲۸۵۰
	اَنّتمُ اول		
اُولُوما	اَنّتمُ دوئم		
ایلی	ایناطرزی		
	انلیل طرزی		
اُوکُش	لُوگل اندا		
لُوگل زغیسی	اُروکاگینا		
		اَبی اِشتار	۲۸۰۰
		خاندانِ کِش	
		شرّوجیق	۲۷۵۰
کُورشیش	انجلیسا	مَنی شتسو	۲۷۰۰
		رومیش	
	خاندانِ لاگش	خاندانِ آکاد	۲۶۵۰
	لوگل اُوشمگل	شرغنی شری	

اُما، ارک اور اُر	لاگش	کش، اوپس، اور اکاد	قبل مسیح
	اُر - بابر	نرم سین	۲۵۵۰
	لوگل یُور		
	باشاماما		
	اُگمی		
	اُرباو		۲۵۰۰
	ناماخنی		
	اُرگر		
	کاآزاغ		
	گلوباُو		
	گا یوگالعد		
	اُرنین		
	اُرنگیراشو		۲۴۵۰
خاندانِ اُر		خاندانِ اُر	۲۴۰۰
اُرنیسو	آراما	اُرانگور	
	اُرلاما	دُنگی	
	آرانانر	بُرسین	۲۳۵۰
		گمل سین	
	ختم شد		

محمد اقبال مجددی
ذخیرہ لاہور

Marfat.com

مصنّف کی دوسری کتابیں

(ا) ESSAYS ON ISLAM
مطبوعہ دین محمدی پریس میکلوڈ روڈ کراچی — قیمت 8/-

(ب) HISTARICAL DISSENTATION
مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی - کراچی — قیمت 10/-

(ج) معارف النفس (رموز تصوف) — قیمت 7/-

مجلس اخوان الصفا
معرفت ادارہ نیا اسلوب ۵۲/۲ مسلم لیگ کوارٹرس
ناظم آباد - کراچی ۱۸

Marfat.com